

الف

عمیرہ احمد

(قسط نمبر ۲)



پیارے بابا!

میں جانتا ہوں اس خط کے لفافے پر میرا نام دیکھ کر آپ چونکے ہوں گے پھر بہت دیر تک آپ نے اس لفافے کو کھولا نہیں ہوگا۔ میرا نام دیکھتے رہے ہوں گے اور آپ کو سب کچھ یاد آتا رہا ہوگا۔ جو میں آپ سے کہہ کر گیا تھا اور جس پر میں آپ سے نادم ہوں۔ آپ نے سوچا ہوگا خط کھولے بغیر لفافے کو پھاڑ کر پھینک دیں مگر یہ آپ سے ہو نہیں سکا ہوگا کیوں کہ میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں..... طحہ عبدالعلی، جسے آپ نے میری ماں کے جانے کے بعد چڑیا کے بچے کی طرح تنہا پالا اور جس کے لیے آپ نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ لفافہ پھاڑ کر پھینک دیتے تو بھی دوبارہ ٹوکری سے نکال کر کاغذ کے ٹکڑوں کو جوڑ لیتے۔ دل تو ہے نہیں یہ کہ ٹوٹ کر نہ جڑتا۔

کیا لکھوں آپ کے نام اس خط میں۔ اپنی شرمساری، اپنی ندامت یا اپنی بے بسی۔ بابا آپ کو چھوڑ کر گیا تھا پر آپ سے کٹ کر رہا نہیں جا رہا۔ آپ یاد آتے رہتے ہیں۔ زیادہ نہیں بس ہر سانس کے ساتھ۔

آپ کا دل دکھایا ہے پر میرے پاس اُس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا..... کیا کرتا؟ آپ کو چھوڑ کر کم از کم زندہ تو رہ رہا ہوں۔ حسن جہاں کو چھوڑ دیتا تو یہ بھی نہ کر پاتا۔ خط پڑھ رہے ہوں گے تو حسن جہاں کے نام پر آپ کے ماتھے پر بل آیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں آپ اب بھی اُس کے لیے اپنا دل بڑا نہیں کر پائے ہوں گے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار آپ کو کسی سے نفرت کرتے دیکھا ہے اور وہ بھی اُس سے جس سے مجھے محبت ہے۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا بابا آپ نفرت نام کی کسی شے سے واقف بھی ہیں۔

آپ تو اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ کائنات سے..... اور اس کائنات میں ایک حسن جہاں بھی ہے جسے اللہ نے دُنیا میں پیدا کر کے اُس کو میرے دل میں رکھ دیا ہے۔ وہ ویسی ہی ”روح“ رکھتی ہے جیسی آپ اور میں، ویسا ہی دل جیسا آپ اور میں۔ پھر بابا آپ مجھے حسن جہاں سے محبت کرنے کے لیے معاف کیوں نہیں کر سکتے۔

میرے بس میں ہوتا اُسے پیار نہ کر پانا تو میں نہ کرتا۔ میرے بس میں ہوتا اُس سے ترک تعلق کرنا تو میں کب کا کر چکا ہوتا۔ پر میرے بس میں کچھ بھی نہیں۔ اُسے دل سے نہیں نکال پاتا، آپ کو دماغ

سے اور میں آج کل دل اور دماغ کی اس جنگ میں صرف ایک بے کار وجود بن کر رہ گیا ہوں۔

آپ کی بددعائیں لگ رہی ہیں مجھے۔ میں جانتا ہوں یہ پڑھتے ہوئے آپ بے قرار ہوئے ہوں گے کیوں کہ آپ تو مجھے بددعا دے ہی نہیں سکتے نا، لیکن آپ کا دل دکھایا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے اللہ ناراض نہ ہوا ہو مجھ سے۔

اب اللہ کا نام نہیں لکھ پاتا میں۔ لکھتا بھی ہوں تو وہ نام میری روح سے نہیں بس ہاتھوں سے لکھا جاتا ہے..... لوگ میرے ہاتھ سے بنی خطاطی کو اب نہیں دیکھتے۔ دنگ ہونا تو دور کی بات ہے اور خریدنا تو اُس سے بھی دور کی بات۔

میں جانتا ہوں آپ کہیں گے دل میں حسن جہاں بسا کر اللہ کا نام لکھو گے تو یہی ہوگا۔ شاید شرک کر بیٹھا ہوں مگر توبہ کی توفیق بھی نہیں ہو پارہی۔ طحہ عبدالعلی بڑی تکلیف میں ہے آج کل۔ اللہ کو پکارتا ہوں تو وہ نہیں سنتا۔ آپ کو پکار رہا ہوں کیوں کہ اللہ آپ کی ہمیشہ سنتا ہے۔ اُسے کہیں طحہ کو معاف کر دے۔ طحہ کے دل سے حسن جہاں مٹا دے، وہاں اپنا ٹھکانہ بنائے۔ طحہ کے ہاتھوں اور روح کو اس قابل رہنے دے کہ وہ اللہ کے نام لکھے تو لوگوں کے دلوں کو موم کر دے۔ اللہ کی کبریائی کے خوف سے۔ منور کرے اللہ کی محبت کے نور سے۔

پر یہ تبھی ہوگا جب آپ طحہ کو معاف کریں گے۔ بابا مجھے معاف کر دیں۔

آپ کا نافرمان بیٹا
طحہ عبدالعلی

☆.....☆.....☆

قلبِ مومن نے بے یقینی کے عالم میں اپنی ماں کے ہاتھوں سے وہ لفافہ لیا تھا۔ اُس پر اُس کا نام لکھا تھا بے حد خوب صورت رسم الخط میں۔ ”اللہ تعالیٰ کی ہینڈ رائٹنگ کتنی خوب صورت ہے۔“ ایک لمحہ کے لیے اُس نے اُس لفافے پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ پھر سر اٹھا کر اپنی ماں کو دیکھا جس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اُس نے لفافہ لیتے ہوئے محسوس کی تھی۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ اپنی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں اور آنسوؤں کو آنکھوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا یا شنگرفی یا گلابی۔ پتا نہیں وہ کون سا رنگ تھا۔ کلربیلٹ کے سارے رنگوں سے زبانی واقف ہونے کے باوجود مومن بوجھ نہیں سکا مگر کم از کم وہ زرد رنگت نہیں تھی۔ وہ زرد رنگت جو وہ اپنے باپ کے جانے کے بعد اپنی ماں کے چہرے پر دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔

وہ ایک خوب صورت سرخ گلاب کی طرح کھل اُٹھی تھی یا شاید جی اُٹھی تھی۔ وہ ماں کو مبہوت

دیکھتا رہا۔

”تم خط نہیں پڑھو گے؟“ اُس کی ماں نے جیسے اُسے یاد دلایا۔

”ہاں..... مگر اسے کھولا کس نے؟“ اس نے ایک دم لفافہ پلٹا اور اُس کا اُٹھا ہوا flap دیکھا۔

”میں نے۔“ کچھ مجرمانہ سے انداز میں اُس کی ماں نے کہا۔ وہ راز جو اُس کے اور اللہ کے

درمیان تھا وہ اُس کی ماں بھی جان گئی تھی اور یہ بات اُس وقت مومن کو اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ چپ چاپ

خط لیے اندر آ گیا تھا۔

میرے پیارے قلبِ مومن

تمہارے سارے خط اللہ تک پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے پڑھ بھی لیے ہیں۔ وہ تمہیں خود اُن

سب کا جواب بھیجنا چاہتے تھے لیکن پھر انہوں نے سوچا وہ تمہارا جواب میرے ذریعے تم تک پہنچا دیں۔

میں 15 تاریخ کو آ رہا ہوں۔ تمہاری سب باتوں کا جواب لے کر۔

تمہارا دادا

عبدالعلی

جس بے قراری اور بے چینی سے اُس نے لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا تھا۔ اُسی

بے قراری کے ساتھ ہی اُس نے خط ختم کیا تھا۔ بے حد مایوسی کے ساتھ۔

”تو یہ خط اللہ تعالیٰ نے لکھ کر نہیں بھیجا۔“ اُس نے عجیب مایوسی سے سوچا۔

”پر دادا یہاں کیوں آرہے ہیں؟“ اُس کے ذہن میں اگلا سوال اُبھرا تھا۔ مگر اُس سے بھی بڑا

سوال یہ تھا کہ دادا کو یہ کیسے پتا چلا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خط بھیج رہا تھا اور دادا کو کیوں اُس کے خطوں کا جواب

دینے کے لیے اللہ نے چنا۔ کیا وہ بھی اللہ کے پاس رہتے تھے۔

سوالات کا ایک انبار تھا جس نے اُس کے ذہن کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔

”مومن۔“ وہ اپنی ماں کی آواز پر بے اختیار پلٹا۔ وہ پتا نہیں کب اُس کے پیچھے کمرے میں

آ گئی تھی۔

”اللہ تعالیٰ نے خود خط کیوں نہیں لکھا مجھے؟“ اُس نے ماں کو دیکھتے ہی بے ساختہ کہا۔

”خود نہیں لکھتے وہ اُن کے پاس بہت سارے لوگ ہوتے ہیں کام کرنے کے لیے۔ اُنہوں

نے کسی کو کہہ دیا ہوگا کام کرنے کے لیے۔“ اُس کی ماں نے اُس کے ہاتھ میں پکڑا خط اُس کے ہاتھ سے

لے کر اُسے بڑی احتیاط سے تہ کر کے لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”انہوں نے دادا سے کہا ہے۔“ مومن کو لگا جیسے اُس کی ماں نے خط دھیان سے نہیں پڑھا تھا۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔“ مدھم آواز اُسے سنائی دی تھی۔ اُس کی ماں اب خط کو اُس کی سٹڈی

ٹیبل پر رکھتے ہوئے اُس پر ایک پیپر ویٹ رکھ رہی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے مومن کو خیال آیا وہ ماں کو بتادے کہ اُس نے خط میں اپنے باپ کو بھیجنے کا کہا

تھا۔ ایک لمحہ کے لیے ہی وہ جھجکا تھا اور پھر اُس نے ماں سے کہہ دیا۔

”لیکن میں نے تو بابا کو بلایا تھا۔ دادا کو تو نہیں بلایا تھا۔“ اُس کے شکوہ کا جواب اُس کی ماں نے

ایک پراسرار مسکراہٹ سے دیا تھا مگر اُس مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں بہت سارے بجلی کے

قمتے سے روشن ہوئے تھے۔

”وہ بھی تو آرہے ہیں۔“ وہ ساکت ہوا پھر خوشی سے بے قابو۔

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“ مومن بے اختیار چلایا تھا۔

جواب میں ایک اور مسکراہٹ آئی تھی اور پھر ایک ہنسی۔ اُس نے باپ کے جانے کے بعد آج

پہلی بار ماں کو کھکھلا کر ہنسنے دیکھا تھا۔ سرخ ہوتے، چمکتے چہرے کے ساتھ۔ مومن کو یقین آ گیا تھا کہ اللہ

تعالیٰ واقعی اُس کے بابا کو بھیج رہے تھے اور وہ بھی اُس کے دادا کے ساتھ جن سے وہ کبھی نہیں ملا تھا۔ مگر اس

سے بھی زیادہ ناقابل یقین بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کے سارے خط مل گئے تھے اور انہوں نے اس

کے خط پڑھ بھی لیے تھے۔ اُس کی ماں کمرے سے جا چکی تھی اور مومن وہیں کھڑا تھا۔ اپنے دل کی

دھڑکنوں کو گنتا۔ وہ کل سکول میں سب کو بتا سکتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو جو خط لکھتا تھا وہ اللہ کو مل گئے تھے اور

اُسے اُن کا جواب بھی ملنے والا تھا مگر اُس سے پہلے اُسے ایک کام کرنا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ بھاگتا جا رہا تھا، پھولے ہوئے سانس کے ساتھ۔ کھیتوں میں لہلاتی سبز فصل کے پتوں بیچ

اُس پگڈنڈی پر جو اُس جنگل کی طرف مڑ رہی تھی۔ اُس کی سائیکل کا ٹائر پتھر تھا اور مومن کل تک انتظار

نہیں کر سکتا تھا۔

سارے دیو، جن، بھوت، چڑیلیں اُسے سب بھول چکی تھیں جو اس جنگل میں کہیں نہ کہیں بستے

تھے اور جن سے پورا قصبہ بچوں کو ڈراتا تھا۔ یاد تھا تو اُسے وہ لیٹر بکس یاد تھا جس میں ڈالے ہوئے خط اللہ

تک پہنچ گئے تھے اور وہ اب تصدیق چاہتا تھا کہ یہ سب جھوٹ نہیں تھا۔ اُس کی ماں کی کوئی طفل تسلی بھی

لیٹر بکس وہیں پڑا تھا جہاں اُس نے رکھا ہوا تھا۔ اس سوکھے ہوئے درخت کے گرے ہوئے تنے پر جو مسلسل ہونے والی بارشوں میں اُسی تنے کی طرح نمی سے گیلا تھا۔ مومن چلتے ہوئے تنے کے پاس آیا اور بے تابی سے اُس نے لیٹر بکس کو درخت کے تنے پر لٹایا اور اُس کا نیچے والا وہ حصہ کھولا جس کو کھول کر خط نکالے جاتے تھے۔ لیٹر بکس بالکل خالی تھا۔ اُس کے 30 کے 30 خط اللہ تک پہنچ چکے تھے۔ مومن کا دل چاہا وہ بے اختیار اُچھلے چینے اور چلائے یا پھر تھوڑا سا ڈانس کر لے۔ تو جو جواب اُس کے پاس آیا تھا وہ اللہ ہی کی طرف سے آیا تھا۔ اُس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر جیسے اپنے کھلے ہوئے ہونٹوں اور کھل کھل پڑتی مسکراہٹ کو بیک وقت چھپایا۔ لیٹر بکس کا نچلا حصہ بند کیا اور اُسے سیدھا کر کے تنے پر رکھا۔ ایک بار پھر مسکرایا پلٹا اور برق رفتاری سے دوبارہ بھاگنے لگا۔ پیروں کے نیچے آنے والے درختوں کے خشک اور سبز پتوں نے اس بار کوئی چرماہٹ نہیں کی تھی کیوں کہ وہ سب بارش کے پانی میں بھیگے ہوئے تھے البتہ جہاں جہاں بھاگتے ہوئے مومن کے قدم پڑ رہے تھے وہاں وہاں پیروں کے نشان گرھوں کی شکل میں پڑ رہے تھے۔ کچھ چھینٹے اڑ کر اُس کی ٹراورز پر بھی لگ رہے تھے۔ پر قلب مومن کو اس وقت کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ نہ کیچڑ کی نہ جنگل کے ویرانے کی نہ ہی اس بات کی کہ اُسے وہاں سے بھاگتے ہوئے ایک لمبا فاصلہ طے کر کے واپس گھر پہنچنا تھا۔ اپنی ماں کے پاس حسن جہاں کے پاس۔



جیولری کے اُس کھلے ہوئے ڈبے کے اندر کچھ بھی نہیں تھا جو کچھ تھا اُس ڈبے کے گرد ریونگ ٹیبل پر بکھرا پڑا تھا اور ڈرینگ ٹیبل کے سامنے حسن جہاں بیٹھی آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ سر پر جوڑے کی شکل میں لپیٹے ہوئے بالوں کو اُس نے ہیئر پن نکالتے ہوئے کھولا تھا۔ وہ سر سے کندھوں تک آئے پھر کندھوں سے نیچے اُس کی کمرے سے لپٹتے ہوئے گرتے چلے گئے۔ بستر پر لیٹا ہوا قلب مومن کروٹ لیے کھلی آنکھوں سے حسن جہاں کو دیکھتا گیا تھا۔ اُس کی ماں بے پناہ خوب صورت تھی۔ اُس نے بہت لوگوں سے سنا تھا اور اُن لوگوں میں اُس کا اپنا باپ بھی تھا اور اب ایک بار پھر وہ اپنی ماں کو اُسی طرح اُس آئینے کے سامنے بیٹھا دیکھ رہا تھا جس طرح وہ اُس کے باپ کے جانے سے پہلے کبھی کبھار بیٹھ کر تیار ہوا کرتی تھی۔ سنگھار کرتی تھی۔ زیور پہنتی تھی اور ”حسن جہاں“ بن جاتی تھی۔ پھر اُس کی ماں نہیں رہتی تھی کیوں کہ اُس پر کسی کی نظر ٹھہرتی ہی نہیں تھی مگر ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا۔ کسی تہوار پر کسی خاص دن یا تب جب وہ یا اُس کا باپ کسی بات پر بہت خوش ہوتے تھے۔

اپنے باپ کے جانے کے بعد مومن نے کبھی اُسے سنگھار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ زیور پہننا تو دور کی بات تھی۔ اُس نے کبھی اپنی ماں کو اس آئینے کے سامنے بیٹھا بھی نہیں دیکھا تھا جس کے سامنے وہ رات کے اس پہر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ رات کے اس پہر اُس کی سٹڈی ٹیبل پر بیٹھ کر روتے اور سسکتے ہوئے وہ خط لکھا کرتی تھی جسے وہ اُس الماری والے ڈبے میں ڈال دیتی تھی۔ مومن کو یہ نہیں پتا تھا کہ وہ اُن خطوں میں کیا لکھتی تھی مگر یہ ضرور پتا تھا کہ وہ یہ خط کس کو لکھتی تھی۔ اُس کے باپ طحہ عبد العلی کو۔

”مُمی آپ کے پاس کتنے زیادہ زیور ہیں!“ وہ بہت دیر بستر پر خاموش لیٹا نہیں رہ سکا۔ اُٹھ کر حسن جہاں کے پاس چلا آیا تھا۔ اور ڈرلینگ ٹیبل پر بکھرے ہوئے زیورات میں سے ایک ہار اُٹھاتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔ حسن جہاں اپنے کانوں میں جھمکے پہن رہی تھی۔ اُس کی بات پر ایک لمحہ کے لیے جیسے وہ ٹھٹکی تھی پھر بے اختیار مسکرائی۔

”سب نقلی ہیں۔“ اُس نے جیسے مومن کو بتایا مگر اُس نے اُس کی بات پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ اس وقت اُس خوب صورت imitation جیولری کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھا۔

”آپ ہمیشہ ایسے رہا کریں۔“ اُس نے ماں سے یک دم فرمائش کی۔ ایک جھومر اُس کے ماتھے کے اوپر بالوں میں لٹکاتے ہوئے۔

”کیسے؟“ وہ ہنسی۔

”ایسے..... خوب صورت اور خوش۔“ مومن کو جتنے آسان الفاظ میں اُسے سمجھانا آیا تھا اُس نے سمجھا دیا تھا۔ اُس کی ماں نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا یوں جیسے حیران ہوئی ہو کہ وہ کیسے جانتا تھا کہ وہ خوش نہیں تھی۔ ماؤں کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ صرف وہی اولاد کا چہرہ پڑھ سکتی ہیں۔ اُنہیں یہ اندازہ نہیں ہوتا اُن کی اولاد بھی اُن کا چہرہ ویسے ہی پڑھ سکتی ہے۔

”تمہارے بابا آرہے ہیں۔ اب ہمیشہ خوش اور خوب صورت رہوں گی۔“ اُس نے مومن کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

”میں نے بلایا ہے اس لیے آرہے ہیں۔“ مومن جتائے بغیر نہیں رہ سکا۔

”ہاں جانتی ہوں تمہارے بلانے پر ہی آرہے ہیں۔ میرے بلانے پر تو کبھی نہ آتے۔“ وہ بچہ تھا پھر بھی ماں کے لہجے میں چھلکتی اُداسی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”بابا گئے کیوں تھے؟“ وہ سوال قلب مومن نے پہلی بار نہیں کیا تھا بلکہ ہر روز کرتا تھا۔

”مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔“ جواب وہی آیا تھا جو ڈیڑھ سال سے آرہا تھا۔

”تو آپ معافی مانگ لیتیں۔“ وہ حل بھی مومن ڈیڑھ سال سے اُس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ معافی مانگنا ایک بات تھی ملنا دوسری۔

”مانگی تھی۔“ اُس کی آواز بھرائی اور اُس نے مومن سے نظریں پُرائیں۔

مومن ماں کا لہجہ ”بریل“ کی طرح پڑھتا تھا۔

”میں بابا سے کہوں گا آپ کو معاف کر دیں۔“ یہ وعدہ بھی پرانا تھا اور مرہم بھی۔ وہ حسن جہاں

کے بالوں کو اب اپنی انگلیوں کے گرد لپیٹ رہا تھا جیسے مسحور مدہوش ہونے والے انداز میں جیسے جادو ٹونا کر رہا ہو۔

”بابا آئیں گے تو آپ سفید گلاب لگائیں گی نا؟“ اُس نے جیسے ماں کو یاد دلایا۔

”سفید گلاب تو تمہارے بابا لاتے تھے میرے لیے..... وہ لائیں گے تو لگا لوں گی۔“ حسن

جہاں کو پتا نہیں کیا یاد آیا۔

”میں لا دوں گا آپ کو۔“ اس نے بے حد پر جوش انداز میں ماں کو اپنی خدمات پیش کیں۔

”تم کہاں سے لاؤ گے؟“ وہ ہنسی۔

”کہیں سے بھی توڑ کر۔“ وہ سوچ میں پڑا۔

”یہ گلاب کا موسم نہیں ہے۔“ حسن جہاں نے اُسے یاد دلایا۔

”میں آپ کے لیے کہیں سے بھی لے آؤں گا۔“ وہ ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ ایسا وعدہ تو کبھی

ٹھانے بھی نہیں کیا تھا۔ اُس کی ہنسی اُس کے آنسو ساتھ لے کر آئی تھی۔ پرانی سہیلی کی طرح۔ مومن نے ماں کی خوب صورت آنکھوں کو ہمیشہ کی طرح پانی سے بھرتے دیکھا۔

”ممی مجھے آپ روتے ہوئے اچھی نہیں لگتیں۔“ اُس نے جیسے بے قرار ہو کر ماں سے کہا۔ ٹھہ

بھی یہی کہتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہر بات میں اسے ٹھہ کی یاد دلاتا تھا۔ حسن جہاں نے اُلٹے ہاتھ سے آنسو رگڑے

تھے۔ آنکھیں خشک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ پھر اُسے دیکھ کر مسکرائی یوں جیسے اسے خوش کرنا چاہتی

ہو۔

”آپ مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہیں یا بابا سے؟“ قلب مومن نے اُس سے سوال کیا۔ وہ ٹھہ کے

سامنے بھی اُس سے یہی پوچھا کرتا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد آج پہلی بار اُس سے دوبارہ پوچھ رہا تھا۔

”تم سے زیادہ بابا سے اور بابا سے زیادہ تم سے۔“ وہ بے اختیار ہنسی۔ مومن نے بُرا منایا۔

”یعنی زیادہ کس سے؟“ اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”جو مجھ سے زیادہ پیار کرتا ہے اُس سے۔“ حسن جہاں نے بے ساختہ کہا۔

”وہ تو میں کرتا ہوں۔“ حسن جہاں نے قلب مومن کی آنکھیں دیکھیں۔ کیا آنکھیں تھیں، کیا معصومیت تھی۔ کیا سچ تھا اور کیا اعتراف تھا۔ محبوب کا اظہارِ محبت عورتِ دل پر لکھتی ہے۔ اولاد کا اظہارِ محبت روح پر۔ پہلا قبر تک جاتا ہے دوسرا آسمانوں تک ساتھ لے کر جاتی ہے۔

”ممی مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس نے ماں سے بالوں کو اپنی انگلیوں کے گرد سے کھولتے ہوئے ایک دم جماہی لی۔ وہ اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ اگر وہ نہ ہوتا تو اس کی زندگی میں کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔ وہ قلب مومن کو بستر پر جا کر لیٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُن سارے نقلی زیورات میں جو وہ اپنے ارد گرد پھیلائے بیٹھی تھی۔ صرف ایک اصلی تھا اس کے پاس، قلب مومن۔



”تو تمہارے بابا آگئے تو پھر تم کیا کرو گے؟“ سکول میں اُس کے سب سے قریبی دوست نے لُنج بریک میں اُس سے پوچھا تھا۔ قلب مومن کے باپ کے واپس آنے کی خبر اُس کی پوری کلاس میں گردش کر رہی تھی۔ اس خبر کے ساتھ کہ قلب مومن نے اللہ کو خط لکھ کر اپنے بابا کو بلوایا تھا۔ وہ دنوں میں جیسے وہاں star بن گیا تھا۔

”پھر ہم یہاں سے چلے جائیں گے ممی کہتی ہیں۔“ اُس نے اطمینان سے اپنے دوست کو بتایا۔

”اور کہاں جاؤ گے تم لوگ؟“ اُس کے دوست نے کریدا۔

”یہ تو نہیں بتایا ممی نے۔“ قلب مومن نے سر کجا کر کہا۔

”تم نے اللہ سے اور کیا کیا مانگا ہے قلب مومن؟“ اس کے دوست نے چند لمحے بعد اپنے لُنج کا سینڈوچ کھاتے ہوئے بالآخر اُس سے وہ سوال پوچھا جس کا اُسے تجسس تھا۔ قلب مومن نے ہونٹ بھیجنے لیے۔ وہ ایک بات بتا چکا تھا ساری باتیں نہیں بتا سکتا تھا۔

اس دن وہ گھر آتے ہوئے بے حد خوش تھا کیوں کہ گھر میں بہت کچھ بن رہا تھا۔ اُس کے بابا کا فیورٹ کیک اور فیورٹ ڈش اور مومن کا فیورٹ ڈونر کباب۔ اُس کی ماں اُس دن اُس سٹور میں کام پر نہیں گئی تھی جہاں وہ سٹور کیپر تھی۔ وہ صبح سے اُس کے بابا کے استقبال کی تیاری میں مصروف تھی۔

مومن کا خیال تھا وہ گھر پہنچے گا تو بابا وہاں آچکے ہوں گے، مگر ایسا نہیں تھا۔ بابا ابھی نہیں آئے تھے اور اُس کی ماں ایک بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔

”ممی.....“ قلب مومن اُس کو دروازہ کھولتے ہی دیکھ کر اپنا سوال بھول گیا تھا۔ حسن جہاں کو

”بس وہ آنے ہی والے ہوں گے۔ مومن تم جلدی سے کپڑے تبدیل کرلو۔ میں کھانا بنا رہی ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے وہاں رُکے بغیر اندر گئی اور اُسی رفتار سے مومن بھی اندر گیا تھا۔

کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اُسے کچھ خیال آیا اور وہ ماں کے پیچھے باورچی خانے میں آ گیا۔

”مُمی وہ جو آدمی ہمارے گھر آیا تھا اس کا کیا نام تھا؟“ کام کرتے ہوئے حسن جہاں نے اس کے سوال کو غور سے نہیں سنا۔

”کون سا آدمی؟“ اس نے مومن کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”جس کی وجہ سے بابا خفا ہو کر گئے تھے۔“ حسن جہاں ساکت ہو گئی تھی۔ ساکت شاید چھوٹا لفظ تھا وہ برف ہوئی تھی۔ پلٹ کر اس نے قلبِ مومن کو دیکھا۔ وہ ڈیڑھ سال بعد بھی اس شخص کو یاد کر رہا تھا جس کی وجہ سے طحہ..... وہ سوچ نہیں سکی۔ مومن اسے دیکھ رہا تھا جیسے عدالت کے آگے کٹہرے میں کھڑے مجرم کو جج دیکھتا ہے۔

”تمہیں سب یاد ہے۔“ وہ اُس سے یہ سوال نہیں کرنا چاہتی تھی جو کر رہی تھی۔ مومن نے سر ہلایا۔ وہ آگے بڑھ آئی۔ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی۔ اسے دونوں کندھوں سے پکڑا اور کہا۔

”وہ کوئی آدمی نہیں ہے۔ تم سب کچھ بھول جاؤ۔“ وہ اُس سے عجیب منت والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ مومن نے سر اثبات میں ہلایا پھر اُس سے پوچھا۔

”وہ دوبارہ تو نہیں آئے گا نا؟“ اُس کے انداز میں ایک عجیب سا خوف تھا جیسے وہ ہر اُس چیز کو وہاں آنے سے روک دینا چاہتا ہو جو اُس کے باپ کو خفا کر سکتی تھی۔

”کبھی نہیں۔“ حسن جہاں نے بے اختیار کہا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا بیرونی دروازے کی بیل بجی تھی۔ مومن نے یک دم ماں سے اپنے آپ کو چھڑایا۔

”بابا آ گئے۔“ وہ بھاگا تھا، بیرونی دروازے کی طرف اور حسن جہاں بھی اُسی طرح باہر لپکی تھی۔ ڈیڑھ سال بعد وہ اُس سے ملنے اُسے دیکھنے جا رہی تھی جو اُس کا محبوب تھا اور اُس سے خفا تھا اور اب لوٹ آیا تھا تو وہ عجب سرشاری اور بے خودی کے عالم میں تھی۔

مومن نے دروازہ کھولا تھا اور دروازے کے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ ساکت ہوا اور ایسا ہی سکتہ اُس کے پیچھے آتی حسن جہاں کو ہوا تھا۔

وہ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتی ہی چلی گئی تھی۔ چہرے پر کچھ تھا ہی نہیں جو اُسے صاف کرنا تھا مگر پھر بھی آنکھیں بند کیے یوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں لیے پانی کو منہ پر مارنا اُسے اچھا لگ رہا تھا۔ شاید پانی اُس کی شرمساری دھوڈالتا جو اُس نے اُس دن محسوس کی تھی اور اُس ذلت کو بھی جو اس وقت اُسے اپنے ماتھے پر چھ رہی تھی۔

”کچھ تو عقل کرتی مومنہ، سیدھا انکار کر کے ہی آگئی۔“ اس نے اپنے عقب میں ثریا کی آواز سنی تھی جو اُسے تو لیا پکڑانے آئی تھی۔

”تو اور کیا کرتی..... منی اسکرٹ پہن کر دکھا دیتی۔“ وہ تلخ ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن ہو گئی تھی۔ تو لیے سے گیلے چہرے کو رگڑتے ہوئے اُس نے جیسے اپنی ہزیمت بھی چھپائی تھی۔

”تو انہیں دو تین سین کر کے دکھاتی۔ وہ اکیٹنگ دیکھتے تو خود رول دیتے تھے۔“ اُس نے تو لیا ہٹا کر ماں کو دیکھا۔ اُن کی سادگی پر اسے ہنسی آئی حالاں کہ اُسے رونا آ رہا تھا۔

”اماں یہاں کسی کو اکیٹنگ ایکسپریشنز پر فارمنس نہیں دیکھنی۔ یہاں سب کو ایکٹریس کا صرف جسم دیکھنا اور دکھانا ہوتا ہے۔“ اُس نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ثریا کو بے اختیار جھک محسوس ہوئی۔ مومنہ کبھی ایسی باتیں تو نہیں کرتی تھی۔

”ایسا بھی کلیوگ نہیں ہے۔“ ثریا نے بے اختیار اُس انڈسٹری کو defend کرنے کی کوشش کی جس کا وہ کبھی حصہ رہی تھی۔

”کلیوگ ہی ہے اماں..... آپ کا زمانہ نہیں ہے یہ۔ اب سینما میں سب شریف اور خاندانی لوگ جاتے ہیں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ مگر دیکھنے وہ بھی آٹم نمبر ہی جاتے ہیں۔“ اُس نے پلٹ کر ماں کو جیسے 21 ویں صدی میں لانے کی کوشش کی۔

”پرائیک چیز پر فارمنس بھی تو ہوتی ہے۔ اکیٹنگ بھی تو ہوتی ہے۔“ ثریا نے اپنے زمانے سے چپکے رہنے کی آخری کوشش کی۔

”وہ آپ کے زمانے میں ہوتی ہوگی اور اُس کی قدر بھی آپ کے زمانے میں ہی ہوتی ہوگی۔ میں جس زمانے میں ہوں اماں اس میں صرف گلیمر بکتا ہے۔ قیمت ہوتی ہے ہر چیز کی ”قدر“ نہیں۔“ وہ ماں سے اب مدہم لہجے میں بات کر رہی تھی۔ جو کچھ اُس کے ساتھ آج ہوا تھا وہ اُن کا تصور نہیں تھا۔

”انتہا پرانا زمانہ تو نہیں تھا میرا۔“ ثریا کے جیسے کیلجے پر ہاتھ پڑا تھا۔
 ”بس یہی کوئی پندرہ بیس سال پہلے ہی کی تو بات تھی۔“ وہ بڑبڑائی تھی۔

”پندرہ بیس سال دودھائیوں کو کہتے ہیں اماں۔“ وہ دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ ثریا نے جیسے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اُس انڈسٹری کا دفاع نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کے لیے وہ اب پرانی اور آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکی تھی۔

”یہ فلم مل جاتی تو جہانگیر کا گردہ ٹرانسپلانٹ ہو جاتا۔ مومن کی ہر فلم ہٹ ہوتی ہے۔ یہ فلم بھی ہٹ ہو جاتی تو تم سٹار بن جاتی۔ کام ہی کام ہوتا تمہارے پاس۔ اس کے بعد کوئی فلم نہ بھی ملتی تو بھی TV پر ہی کام مل جاتا۔ جہانگیر کا علاج.....“ ثریا خود کلامی کی طرح بات کر رہی تھیں۔ یوں جیسے انہیں اُس خیالی محل کو توڑتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی جو وہ کل سے مومن کی فلم میں اُسے کام مل جانے کے تصور پر ہی کھڑا کر کے بیٹھ گئی تھیں۔ جملے کے آخر تک جاتے جاتے انہوں نے مومنہ کا چہرہ دیکھا تھا اور اس کے چہرے کی ندامت نے جیسے کچھ دیر کے لیے ان کی آواز چھینی تھی۔ مومنہ اب ماں کا چہرہ کسی مجرم کی طرح دیکھ رہی تھی جس کا جرم ثابت ہو گیا تھا اب سزا کا اعلان باقی تھا۔

”کھانا، کھانے کا تو پوچھا ہی نہیں میں نے۔“ ثریا کو یک دم خیال آیا۔ اُس کے پاس اب بھی ایک چیز ایسی تھی جس کا ذکر کر کے وہ اس صورت حال سے مومنہ اور خود کو بچا سکتی تھی۔

”نہیں بھوک نہیں ہے اماں۔“ مومنہ اندر کمرے میں جانے کے لیے پلٹی تھی۔

”شوٹ پر کچھ کھا لیا نا؟“ ثریا پیچھے آئی تھی یوں جیسے اپنا احساس جرم کم کرنا چاہتی ہو۔

”ہاں کھا لیا۔“ اس نے آج کچھ بھی نہیں کھا یا تھا لیکن اس کے باوجود اُسے بھوک بھی نہیں تھی۔

کچھ دن ہوتے ہیں اچھے اور کچھ دن ہوتے ہیں بُرے مگر مومنہ سلطان کے دن کم بُرے اور زیادہ بُرے کی کیٹیگریز میں بٹے ہوئے تھے۔ اندر کمرے میں نیم تاریکی تھی اور ٹھنڈک مگر وہاں جہانگیر بھی تھا۔ اُس کے انتظار میں بیٹھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور جہانگیر نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اُس کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر شاید اس نے صحن میں ہونے والی ساری گفت گو سن لی تھی۔ بہن کے لیے اس کے پاس سوال نہیں تھے مگر اس کی نگاہ میں ہمدردی تھی۔ وہ جس دریا میں سے روز گزر کر آتی تھی وہ دریا اس کی وجہ سے مومنہ کی زندگی میں آیا تھا اور جہانگیر کو اس پر ندامت تھی، رنج تھا مگر وہ بے بس تھا۔ بالکل اس گھر کے باقی تینوں افراد کی طرح۔ وہ اُن سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اُسے مرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ وہ کہہ بھی دیتا تو بھی وہ نہ چھوڑتے، کبھی اُن سب نے بہت اچھا وقت بھی دیکھا تھا، پہلے تب جب سلطان فلم انڈسٹری میں کام کر رہا تھا۔ پھر تب جب جہانگیر کو چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر کام ملنا شروع ہو گیا تھا، مگر وہ سارا وقت اب صرف یادوں اور حقیقت کی شکل میں تھا۔ زندگی وہ تھی جو اُن کے

”تم ایک دن بہت بڑی سٹار.....“ لمبی خاموشی کے بعد جہانگیر نے اُس کے لیے جو جملہ ڈھونڈا تھا مومنہ نے اُسے بیچ میں ہی کاٹ دیا تھا۔

”میں خواب نہیں دیکھتی جہانگیر..... نہ خیالی پلاؤ پکاتی ہوں اور تم مجھے تسلی مت دو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے جہانگیر سے کہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر اور اپنی بات کے آخر تک وہ عجیب انداز میں کمزور پڑی تھی۔ وہ سیاہ حلقے، بجھتی ہوئی آنکھیں، گھلتا ہوا وجود مومنہ سلطان کے ہر حوصلے کو مٹی کر دیتا تھا۔ ہر سوچ کو ردی، ہر خواہش کو پانی۔ وہ اُس کے سامنے یہ تک نہیں کہہ پائی تھی کہ اگر دنیا میں کوئی چیز اُس کے قدموں کے نیچے سے ریت بن کر سرکتی ہے تو وہ جہانگیر کی بیماری کا خیال تھا، باقی کسی چیز کو وہ کچھ نہیں گردانتی تھی۔

”میں جانتا ہوں آپ خطاط بننا چاہتی تھیں اور آرٹ پڑھنا چاہتی تھیں۔ میں آڑے آگیا۔“ جہانگیر نے سر جھکا کر کہا۔ وہ غلط وقت پر اُسے یہ سب یاد دل رہا تھا۔

”خطاطی میں آج بھی کرتی ہوں، آرٹ میں کبھی بھی پڑھ لوں گی۔“ وہ اگلا جملہ جو کہنا چاہتی تھی اُسے کہہ نہیں پائی، لیکن تمہاری زندگی کو میں کسی ٹائم مشین پر نہیں ڈال سکتی کہ آگے لے جاؤں۔ مزید کچھ کہے بغیر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اُسے قلب مومن سے اُس لمحہ شدید نفرت محسوس ہوئی تھی، اُس کے سارے جملے اُس کے کانوں میں اب بھی گونج رہے تھے۔

بستر پر لیٹ کر اپنی چادر تاننے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر جیسے اپنی اُس دنیا میں جانے کی کوشش کی تھی اور وہ ناکام رہی تھی۔ اس کے اوپر تنی چادر کے اندر سے قلب مومن کا چہرہ دکھنے لگا تھا۔ بالکل ایسے جیسے کسی پروجیکٹر کی سکرین پر۔ اس کی نظریں ان آنکھوں میں اُس کے لیے جھلکنے والی حقارت، وہ رعونت جس سے اُس نے مومنہ کا بازو پکڑا تھا اور وہ جملے۔ وہ سب کچھ جیسے پروجیکٹر کے اوپر چلنے والی کسی فلم کی طرح دیکھ رہی تھی۔

چادر کو اس نے یک دم اپنے سر سے اتارا تھا اور سانس لینے کی کوشش کی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ قلب مومن کا تکبر کسی آکٹوپس کی طرح اُس کی سوچوں کو اپنے شکنجے میں لیے بیٹھا تھا۔ وہ جس انڈسٹری میں تھی وہاں ہتک اور توہین اُس کے لیے ان چکھے پھل نہیں تھے نہ غرور اور تکبر وہ پرندہ جسے اس نے کبھی دیکھا ہی نہ ہو، مگر پہلی بار کسی نے اس کی اس طرح بے عزتی کی تھی، کام مانگنے پر۔ ورنہ کوئی بھی سامنے کچھ برا نہیں کہتا تھا۔ کہنا بھی ہوتا تو پیٹھ پیچھے کہتا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ کسی نے صرف کام مانگنے پر

اُسے یہ سب کہا تھا۔ اُس نے قلبِ مومن کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ اُسے دوبارہ کبھی زندگی میں اُس کا سامنا کرنا ہی نہیں تھا اور زندگی..... زندگی میں تو ایسا بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اُس نے جیسے خود کو بہلانے کی کوشش کی تھی۔ زندگی میں تو ایک فیصل بھی ہوتا ہے جو نہیں ملتا اور یہ تو صرف ایک فلم تھی۔ اُسے اپنی تسلی اور بہلاوے پر یک دم ہنسی آئی۔ اس کا دماغ فیصل کو کہاں سے لے آیا تھا یا پھر دل تھا جو اُس کو اُس وقت لایا تھا جب اُسے مرہم کی ضرورت تھی۔ آنکھیں بند کیے اس نے بے بسی سے اپنا ماتھا چھوا۔ پہلے وہ قلبِ مومن کو اپنے ذہن سے نکالنے کی جدوجہد کر رہی تھی اب اُسے فیصل کو بھی نکالنا تھا۔ نیند آج اُس کے مقدر میں ہی نہیں تھی۔

UA BOOKS



کوئی رنگ کالا..... کوئی پیلا

کوئی لال گلابی کر دا.....

بلھے شاہ رنگ مرشد والا

کسے کسے نوں چڑھدا.....

وہاں بیٹھا پورا مجمع اُس کلام کے اُن جملوں میں بے اختیار ہاتھ اور بازو اٹھا اٹھا کر داد دے اٹھا تھا اور داد دینے والوں میں نہیابھی تھی جو اُس کے برابر فرشی نشست پر بالکل پہلی قطار میں تھی۔ گلوکار منجھا ہوا تھا اور پکے سر کے ساتھ گارہا تھا اور بار بار اُن جملوں کو دہرا رہا تھا جس پر اُسے داد مل رہی تھی۔ چالیس پچاس لوگوں کا وہ مجمع جیسے جھوم رہا تھا۔ کچھ کے ہاتھوں میں مشروب کے گلاسز تھے اور کچھ اُس سونف اور سپاری کو بار بار لے کر منہ میں ڈال رہے تھے جس کی ٹرے لیے ویٹر بار بار چکر لگا رہا تھا اور کچھ فرشی نشست پر تقریباً نیم دراز آنکھیں بند کیے سرور کے کسی عالم میں پہنچے ہوئے تھے۔ گلوکار نے بلاشبہ سماں باندھ دیا تھا اور اس مجمع میں صرف چند لوگ تھے جو گلوکار کو کسی داد و تحسین کے بلند و بانگ اظہار کے بغیر سن رہے تھے اور اُن میں سے ایک قلبِ مومن بھی تھا۔ وہ گلوکار پر بہ غور نظریں جمائے ہوئے تھا مگر اُس کے کہنے پر لہک نہیں رہا تھا نہ دوسروں کے کہنے پر بہک رہا تھا۔ نہ ہاتھ پاؤں اور سر کو گلوکار کی تانوں اور اُس کے میوزک پر ہی ہلا رہا تھا۔ وہ بس سُن رہا تھا۔ کسی جملے پر وہ محظوظ ہوتا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی اور سر کی ہلکی سی جنبش پر وہ داد دیتا لیکن ایسا شاید اس ڈیڑھ گھنٹہ کی محفل میں دو یا تین بار ہی ہوا تھا۔ وہ وہاں نہیابہا کے اصرار پر آیا تھا ورنہ اُسے صوفی کلام کی محفلوں میں آنے اور وقت گزارنے میں دل چسپی نہیں تھی۔ یہ اُس کے مزاج کی موسیقی نہیں تھی مگر نہیابہا کو وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔

"Uff.... so spiritual" نیہا نے اُس کے برابر بیٹھتے ہوئے گلوکار کی کسی لائن پر جھومتے

ہوئے قلبِ مومن کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

Spiritual کیا تھا اُس گانے اور اُس کے کلام میں یہ مومن جان نہیں پارہا تھا۔ آواز کمال تھی

طبلہ اور ہارمونیم بجانے والے اپنے کام کے ماہر تھے۔ لیکن بس اس کے علاوہ تو کچھ بھی نہیں تھا جس پر وہاں موجود لوگ "Spiritual" ہو رہے تھے۔

کئی جاگن کئی جاگ نہ جان

کئی جاگدیاں وی سُتے ہو

کئی لوگ جاگتے جاگتے لٹ گئے اور کئی سونے کی حالت میں بھی پا گئے۔

کیاں نوں رب ستیاں ملیا

کئی جاگدے وی گئے مُٹھے ہو

گلوکار نے اگلا کلام شروع کیا تھا اور قلبِ مومن نے نیہا کے کان میں سرگوشی کی۔ ”چلیں؟“

اُس نے حیرانی سے مومن کو دیکھا اور کہا۔ ”کہاں؟“

”تمہارے لیے ایک سر پرانز ہے۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے نیہا کے کان میں ایک اور

سرگوشی کی۔ اُس نے جواباً بے حد تجسس کے عالم میں مومن کا چہرہ دیکھا جس پر ایک عجیب سی مسکراہٹ

تھی۔ مزید کچھ کہے بغیر نیہا وہاں سے اُٹھ کر اُس کے ساتھ باہر تو آ گئی لیکن وہ اب بھی ایک عجیب سی

کیفیت میں تھی۔ اُن کی گاڑی گاڑیوں کی لمبی قطار کے تقریباً آخری سرے پر تھی جو اُس گھر کے باہر سڑک

کے کنارے کھڑی تھیں جہاں وہ یہ محفل موسیقی اٹینڈ کرنے آئے تھے۔

”کمال ہی کر دیا۔ مجھے لگ رہا ہے میں صوفی ہو گئی ہوں۔“ اُس کے ساتھ چلتے ہوئے نیہا نے

اپنے عریاں بازوؤں کو عجیب سرمستی کے عالم میں سر سے اوپر بلند کرتے ہوئے لہراتے ہوئے کہا۔ وہ اس

وقت ایک سیلیولیس بلاؤز اور لانگ اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ وہ مختصر بلاؤز اُس کی کمر اور پیٹ کا تھوڑا سا

حصہ دکھا رہا تھا۔ اُس سفید سلک کے بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ میں وہ گلے میں بہت ساری لمبی اور چھوٹی

زنجیریں اور پتھر پہنے ہوئے تھی۔ جنہوں نے اُس کے سینے کو تقریباً چھپا دیا تھا۔ باہر چلتی ہوا اُس کے کٹے

ہوئے بالوں اور لٹکے ہوئے اسکرٹ کو بار بار اٹھا رہی تھی اور نیہا دونوں سے بے پروا تھی۔ نہ وہ بالوں کو

اُڑ کر اپنے چہرے اور ماتھے پر آنے سے روک رہی تھی نہ اپنی لمبی خوبصورت ٹانگوں سے بار بار ہوا سے

اُٹھنے والے اسکرٹ کو۔ انگلیوں میں دبے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے اُس نے گلوکار کے بول

”مومن میں صوفی ہوگئی ہوں۔“ اُس کے ساتھ چلتے ہوئے مومن نے اُس کے پہلے جملے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا اور نہیہا نے جیسے اُس کی توجہ لینے کے لیے اُسے دوبارہ وہ جملہ دہرایا۔

”وہ تو تم ہر بار ایسی کسی محفل کو اینڈ کرنے کے بعد چند گھنٹوں کے لیے ہو جاتی ہو۔ اس لیے پریشان مت ہو۔ چند گھنٹوں بعد ٹھیک ہو جاؤ گی تم۔“ ساتھ چلتے ہوئے مومن نے اپنی ٹراؤزر کی جیب سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے اُسے جیسے تسلی دی۔

”نہیں یار..... آج کچھ اور ہی کیفیت ہوگئی ہے میری۔“ نہیہا نے جیسے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ وہ متاثر نہیں ہوا۔ ”اچھا good for you“ اُس نے ساتھ چلتے ہوئے اسی انداز میں اُس کو کہا۔ ”تم یہ قوالی اپنی فلم میں ڈالو نا۔“ نہیہا نے یک دم گلوکار کی سب سے پہلی قوالی کے بول دہراتے ہوئے مومن سے کہا۔ وہ اُس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ ”میری فلم میں قوالی کا کیا کام؟“

”یار Spirituality آئے گی۔“ نہیہا نے جیسے دلیل دی۔

”یعنی میری فلم کا شو دیکھتے ہی audience سینما میں مسجد ڈھونڈنا شروع کر دے گی۔“ اُس نے مذاق اڑانے والے انداز میں نہیہا سے کہا تھا۔

”تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتی میں۔ suggestion دے رہی تھی۔ بالی ووڈ کی فلمز میں نہیں دیکھا۔ ہر فلم میں قوالی ڈالتا ہے سلمان خان اور ہر فلم سپر ہٹ۔“ نہیہا نے جیسے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ سڑک پر اب بھی وہی بول گانے اور لہرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بازو پھیلا پھیلا کر۔ وہاں کھڑی گاڑیوں کے ڈرائیورز کی خود پر مرکوز تعاقب کرتی ہوئی نظروں سے بے خبر۔

”میری قوالی کے بغیر بھی سپر ہٹ ہوتی ہے فلم۔“ مومن کو اس وقت سلمان خان کا حوالہ برا لگا۔

”اُس کی فلم 100 کروڑ کرتی ہے۔“ نہیہا واقعی کسی اور کیفیت میں تھی ورنہ اُس کے ساتھ سلمان خان کے لیے argue نہ کرتی جو مومن کا ناپسندیدہ ترین اداکار تھا۔

”وہ spirituality اور قوالی سے 100 کروڑ نہیں بناتا۔ آئیٹم نمبر سے بناتا ہے۔“ اپنی گاڑی کا لاک دور سے ہی کھولتے ہوئے اُس نے نہیہا کو جواب دیا۔ اُس کی گاڑی نے دور ہی سے لائٹس جھپکا کر جیسے اُس کا استقبال کیا تھا۔

”Whatever..... لیکن تم میری حالت نہیں دیکھ رہے۔ کبھی اس حالت میں دیکھا ہے تم نے مجھے۔ یہ spirituality نہیں تو کیا ہے۔“ نہیہا نے اُس کی بات کا بُرا منایا۔

”یہ اُن چرس والے اسکریٹوں کا اثر ہے جو تم بار بار ٹیس پر جا کر پی کر آ رہی تھی۔ spirituality نہیں ہے یہ۔“ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا تھا۔

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم کو بڑا پتا ہے spirituality کا..... اور by the way میں نے صرف دو اسکریٹس پیئے تھے۔ دو سے مجھے کچھ نہیں ہوتا۔“ نیہا نے بھی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اُسے جواب دیا اور ساتھ ہی اُسے کچھ یاد آیا۔

”تم نے صوفی کا رخہ دیکھا؟“ مومن گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بے اختیار ہنسا۔

”تم صوفی سے صوفی پر آ گئی..... اتنی جلدی؟“

”بکومت..... کیا پہن کے آئی ہوئی تھی وہ اور pretend یوں کر رہی تھی جیسے پتا نہیں کون سے planet کی ڈیزائنر ہو۔“ نیہا کا دماغ واقعی اب اُس صوفیانہ کلام سے سیکنڈز میں اُس ڈیزائنر پر آ گیا تھا جو اُس کی حریف تھی۔

"I loved her clothes. Her sense of style is amazing."

مومن نے جواباً کہا۔ وہ ایسا ہی تھا نیہا اُس کی گرل فرینڈ تھی مگر مومن کو جو چیز اچھی لگتی تھی وہ اُس کے بارے میں کھلے دل سے تبصرہ کرتا تھا۔

You dare not. She was looking ridiculous in those clothes.

نہ ہونے کے برابر کپڑے پہنے ہوئے تھے اس نے تاکہ سب مرد اُسے دیکھیں، Cheap حرکت۔ نیہا کے لمبے میں عجیب طرح کی مڈل کلاس جیلیسی گونجی تھی۔

”اگر یہ strategy تھی تو اس کی strategy بالکل ٹھیک تھی کیوں کہ سب مرد واقعی اُسے ہی دیکھ رہے تھے میں بھی.....“ She looked Hot..... مومن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اُسے بتایا۔ وہ جانتا تھا نیہا صوفی کو پسند نہیں کرتی۔

”مومن.....“ نیہا نے جیسے اُسے خبردار کیا۔

”مجھ سے اگلی فلم میں وارڈروب ڈیزائن کرنے کی بات کر رہی تھی۔“ مومن نے اُس کی لٹاکر کے جواب میں کہا۔ نیہا کو جیسے آگ لگ گئی۔

”اس کی اتنی ہمت.....“

”یار پرفیشنل ہے Opportunity دیکھ رہی ہے۔ وہ میرے ساتھ کام کر کے۔“ مومن نے جیسے اُس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”تم اس کے ساتھ کام نہیں کرو گے۔ میں ہی تمہاری اگلی فلم کی وارڈروب بھی کروں گی۔ سناتم

نے۔“ وہ ہنسا۔

”سن لیا یا رکریلینا۔ اب غصہ ختم کرو۔ تم وہ صوفی ہونے اور Spirituality کی بات کر رہی

تھی وہ بتاؤ مجھے۔“

”مذاق مت اڑاؤ میرا۔“ نیہا اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

”وہ سر پرانز کیا تھا جو مجھے دینا چاہتے تھے۔“ اُسے یک دم یاد آیا۔ مومن نے جواب دینے کی

بجائے اپنی گاڑی کچی جگہ سے سڑک پر لاتے ہوئے کہا۔

”میرے اپارٹمنٹ چلو پھر بتاتا ہوں تمہیں۔“ نیہا نے دل چسپی سے اسے دیکھا۔ اسے اس

”سر پرانز“ کا بے حد انتظار تھا اور توقع بھی لیکن وہ یہ کنفرم کرنا چاہتی تھی خوشی کے کسی اظہار کے بغیر کہ وہ

خوش فہمی کا شکار نہیں ہو رہی تھی۔

اپنے پینٹ ہاؤس کا دروازہ کی کارڈ سے کھولتے ہوئے نیہا کو لیے وہ اندر آیا تھا اور اندر آتے ہی

سب سے پہلے اس کی نظر لابی میں دیوار کے ساتھ پڑے console پر رکھے ایک سفید لفافے پر پڑی

تھی۔ وہ یقیناً شکور نے کوریئر سے وصول کرنے کے بعد ہمیشہ کی طرح وہاں رکھا تھا جہاں اُس کی ڈاک وہ

رکھتا تھا۔ نیہا اب بھی مسلسل صوفی کے حوالے سے کچھ بولتی جا رہی تھی مگر چند لمحوں کے لیے اسے لفافے پر

نظر ڈالتے ہوئے وہ جیسے اپنے ماحول سے غافل ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے نیہا کے

بغیر اندر لاؤنج میں چلی گئی تھی اور مومن سیدھا اُس console کی طرف آیا تھا۔ اُس نے لفافے کو اٹھا کر

دیکھا۔ موتیوں جیسی تحریر میں لفافے پر اُس کا نام لکھا ہوا تھا۔ اُسی انداز میں جس طرح ہمیشہ لکھا ہوتا تھا۔

اُس نے انگلیوں سے جیسے لکھنے والے کے لمس کو اپنے نام پر ہاتھ پھیر کر ڈھونڈا، محسوس کیا، پھر لفافے کو بغیر

کھولے اُس نے console کا دروازہ کھول کر اندر رکھ دیا۔ وہ دراز اُن جیسے بہت سے ان کھلے لفافوں

سے بھرا ہوا تھا اور ان سب پر ایک ہی نام تھا..... قلب مومن۔

نیہا ٹیرس میں پڑی میز کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جب وہ وہاں آیا تھا۔ ٹیرس پر رات کے اس پہر

پورے شہر کی عمارتوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ دور سمندر میں ڈولتی کچھ بوٹس اور جہازوں کی بھی۔ نیہا

کے ہاتھ میں شیمپین گلاس تھا جس میں وہ فریج سے کچھ پانی ڈال کر لائی تھی اور اب اُس ٹیرس پر میز کے

سامنے کرسی پر بیٹھی وہ سمندر کی طرف گردن موڑے اُس پانی کو آہستہ آہستہ پینے میں مصروف تھی۔ ہوا

اُس کے بالوں کو اڑاتی اوپر لے جاتی۔ پھر نیچے لے آتی۔ سمندر کی لہروں کی طرح..... اور وہ مومن کے

انتظار میں کسی خوب صورت پینٹنگ کی اکیلی لڑکی کی طرح ٹیرس پر لگی خوب صورت لائٹس سے نکلتی روشنی میں بیٹھی تھی۔ مومن کے آنے پر اُس نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا پھر مسکرائی اور گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔ مومن اُس کے بالمقابل دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے اس کے سامنے بورڈ پر فریم کے بغیر ایک painting رکھی۔ یہاں بے ساختہ مایوس ہوئی وہ یہ سر پرانز دیکھنے یہاں نہیں آئی تھی۔ مومن کبھی کبھار paint کیا کرتا تھا اور اکثر اسے paint کرتا تھا اور وہ painting بھی اسی کی ہی تھی۔ وہیں ٹیرس میں اسی میز پر اسی طرح ہوا میں اڑتے بالوں اور شیمپین گلاس میں پانی پیتے ہوئے۔

”تمہارا فیورٹ پوز اور میری فیورٹ پینٹنگ۔“ مومن نے جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ یہاں کولگا وہ جیسے اُس سے داد چاہتا تھا۔

”Its Beautiful“ اس نے پینٹنگ پر غور کیے بغیر کہا۔ وہ ہمیشہ یہیں بیٹھتی تھی۔ اسی طرح پانی پیا کرتی تھی اور مومن نے اسے ماڈلنگ کے لیے بٹھائے بغیر اسے اسی طرح paint کیا تھا۔

یہاں نے ایک نظر painting پر ڈالتے ہوئے اپنا گلاس دوبارہ اٹھایا اور تبھی اس کی نظر میز پر رکھی اُس painting میں اپنے ہاتھ کی انگلی میں ایک ring جگمگاتی نظر آئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اسے شائبہ ہوا کہ وہ بھی painted تھی مگر غور سے دیکھنے پر اسے نظر آ گیا تھا کہ وہ painting نہیں تھی، اصلی تھی۔ اس کے رگ و پے میں جیسے ایک کرنٹ دوڑا تھا۔ اُس نے نظر اٹھا کر مومن کو دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔

”You are.....“ یہاں نے بے حد ایکسائٹمنٹ کے عالم میں اُسے کچھ کہتے کہتے جملہ اُدھورا چھوڑا اور اُس painting میں اپنی انگلی کے گرد نظر آنے والی اس ring کو اس جگہ سے نکالنے لگی جہاں وہ دھنسی ہوئی تھی۔

”مومن.....“ یہاں کی آواز فرط جذبات سے بھر آئی تھی۔ وہ اس ڈائمنڈ رنگ کو اب بے حد جذباتی انداز میں اپنی انگلی اور انگوٹھے کی پوروں کے درمیان پکڑے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ مومن نے اس کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی لے لی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلی میں وہ ring پہنا دی۔

”This is beautiful.“ یہاں نے اپنے ہاتھ میں پہنائی گئی اس ring کو دیکھتے ہوئے خوشی اور ایکسائٹمنٹ سے کہا۔

”تمہارے ہاتھ سے زیادہ نہیں۔“ مومن نے بڑی آہستگی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے اُس کے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھوا اور پھر اُسے چھوڑ دیا۔

”I love you.“ یہاں نے جیسے اسے respond کیا۔

”I love you too.“ مومن نے جواباً کہا۔ ”یہاں اب اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ چمکتی

آنکھوں کے ساتھ۔

”تمہارا taste ہر چیز میں matchless ہے۔“ وہ اُس ring کو دیکھتے ہوئے مومن کو

سراہے بغیر نہیں رہ سکی۔

”یعنی تم indirectly اپنے آپ کو appreciate کر رہی ہو۔“ مومن نے برجستہ کہا اور نیہا

نے اس کے جملے پر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ دوبارہ میز پر دھرے مومن کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے appreciate کرنے کے لیے تم کافی ہو۔ یقیناً نہیں آ رہا۔ قلب مومن تم مجھے پرپوز

کر رہے ہو۔“ نیہا اس وقت خود پر ضبط نہیں کر پا رہی تھی۔

”کیا اچھا لگا مجھ میں؟“ اُس نے عجیب سی ادا کے ساتھ مومن سے پوچھا۔ یوں جیسے اپنی

تعریف سننا چاہتی ہو۔ مومن نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر دل کی جگہ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں تم یہاں اچھی لگ گئی۔“ وہ اُس کے جملے پر ہنسی اور پھر اس نے اپنی کنپٹی پر انگلی رکھتے

ہوئے کہا۔

”دل کو اچھی لگی یاد ماغ کو؟“

”میں دماغ سے نہیں سوچتا۔ قلب مومن ہوں میں دل ہی فیصلہ کرتا ہے ہر بات کا۔“ مومن

نے عجیب بے نیازانہ انداز میں اس سے کہا۔

نیہا نے اپنی انگلیوں کے گرد جیسے کچھ لپیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس سے کہا۔ ”جب تم اس

طرح بات کرتے ہو تو تم لڑکیوں کے دلوں کو اپنی انگلیوں کے گرد لپیٹ لیتے ہو قلب مومن۔“ وہ اُس کی

بات پر مسکرایا۔

”جانتا ہوں لیکن قلب مومن تمہاری مٹھی میں ہے۔“ نیہا اُس کے اعتراف پر عجیب غرور سے

مسکرائی پھر ہنس دی۔ اُس کی مسکراہٹ کمال تھی اُس کی ہنسی جمال۔ اُس کے کانوں میں لٹکتے موتی

ہلکورے لے رہے تھے اور اُس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اپنی گہری سیاہ لمبی پلکوں والی آنکھوں کے

ساتھ وہ قلب مومن کی آنکھوں اور دل میں بیک وقت کبھی تھی اور اُسے کسی کی یاد دلا گئی تھی۔

”تم حسن جہاں جیسی ہو۔“ اُس کے چہرے پر نظریں جمائے وہ جیسے کسی ٹرانس میں بولا تھا۔

وہ ہنسی ”حسن جہاں جیسی کیوں؟ حسن جہاں کیوں نہیں؟“ اُس نے عجیب غرور سے اُس

حوالے کو سمجھا بغیر کہا جو قلب مومن کے اندر سے کہیں نکلا تھا۔

”حسن جہاں بس ایک ہی تھی۔“ قلبِ مومن نے نیہا کے گلاس کے کناروں پر اُس کی لب اسٹک سے بنے ہونٹوں کے نشانوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

☆.....☆.....☆

”کتنی بڑی Opportunity تھی مومنہ سلطان جو تم نے ضائع کی ہے۔“ مومنہ نے ڈھیٹوں کی طرح اُس کی لعنت و ملامت سنی تھی۔ ”وہ سیٹ پر اقصیٰ کو اُس سوپ کے لیے میک اپ کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ کیوں کہ اُس کا سین شروع ہونے والا تھا اور مومنہ چپ چاپ بیٹھے اُسے دیکھ رہی تھی۔

”اب بول مومنہ میں گھنگھنیاں ڈال کر کیوں بیٹھ گئی ہو۔“ اُس نے بلش آن لگاتے لگاتے مومنہ کو

مزید گھر کا۔

”میں کریکٹر کی ڈیمانڈ پوری نہیں کر سکتی تھی نہ ہی ڈائریکٹر کی۔“ اُس نے بالآخر کہا۔ اقصیٰ نے

ہاتھ میں پکڑا برش تقریباً پٹختے ہوئے اُس سے کہا۔

”اس لیے ساری عمر بہنوں اور سہیلیوں کے رول کروگی اور پھر خالہ اور چچیوں کے۔ نام بنانے

کے لیے ”سب“ کرنا پڑتا ہے مومنہ سلطان اور ”سب“ ہی کر رہی ہیں۔ سناتم نے۔“

”سن لیا۔“ اُس نے بحث ختم کرنے کی کوشش کی۔ ”سن لیا مگر سمجھنا مت، سیکھنا مت۔ کتنی منتیں

کر کر کے میں نے داؤد سے تمہارا آڈیشن کروایا تھا اور تم وہاں لڑ کر آ گئی۔ وہ بھی قلبِ مومن سے۔ کوئی

عقل کا اندھا بھی ایسا نہ کرتا اور تم تو مجبور اور ضرورت مند تھی مومنہ۔“ وہ جیسے اُسے یاد دلانے کی کوشش

کر رہی تھی۔ مومنہ نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔ یہ جملے تو اب اُس کے ماتھے پر لٹک رہے تھے لیبل کی

طرح۔ کوئی اُسے نہ بھی یاد کرواتا پھر بھی نظر آتا۔

”بد تمیزی اُس نے کی تھی مجھ سے، میں نے کیا کیا۔“ اُس نے جیسے خود کو defend کرنے کی

کوشش کی۔

”وہ کر سکتا ہے۔ ڈائریکٹر ہے۔ سکھ چلتا ہے اس وقت انڈسٹری میں اُس کا، اُس کی فلم میں

کاسٹ ہونے کے لیے ہیر وینین طواف کرتی ہیں اُس کا۔ وہ سیٹ پر گالیاں بھی دے تو بھی کوئی اُف نہیں

کرتا..... اور تم اُسے کہہ کر آئی ہو Cheap۔“

اقصیٰ نے آخری لفظ یوں کہا جیسے وہ گناہ تھا جو مومنہ سے ہو گیا تھا۔

”دماغ خراب ہو گیا تھا میرا۔“ مومنہ پچھتائی نہیں لیکن بڑ بڑائی۔ اقصیٰ کو وہ صرف اسی طرح

خاموش کر سکتی تھی لیکن اُس کی یہ حکمت عملی بھی غلط ثابت ہوئی تھی۔

”اب پچھتانے کا فائدہ۔“ اُس نے فوراً کہا۔

”پچھتا نہیں رہی۔ مجھے اُس کے پاس جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ I am sorry۔“ اُس نے اپنی

عزت اور انا کو تو کب کا ماریا تھا مگر خود داری تھی جو پتا نہیں کیوں اب بھی زندہ رہ گئی تھی۔

”تمہاری وجہ سے اُس نے داؤد کو کتنا ذلیل کیا کہ کہاں سے اُٹھالائے ہو لڑکیاں آڈیشن کے

لیے جن کا نہ کوئی خاندان ہے نہ کلاس نہ گرومنگ۔“ اقصیٰ کو داؤد کی بے عزتی کا صدمہ نہیں بھول رہا تھا۔

”جس کا خاندان اور کلاس ہے وہ کیا کر رہا ہے۔“ مومنہ اُس کے جملے پر تپ گئی۔ اقصیٰ نے

لامتنی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”گھنٹے سے سرکھپا رہی ہوں اور پھر وہی بات۔ ٹھیک کہہ رہی تھی تم کہ تمہیں اُس کے پاس جانا

ہی نہیں چاہیے تھا۔ داؤد نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ فلم ہے فلم۔ سوپ اور سیریل سمجھ کر مت آنا اس

میں کام کرنے۔“ اقصیٰ کا میک اپ اب ختم ہو چکا تھا اور وہ تیار تھی۔

”میرا مسئلہ اس وقت صرف پیسہ ہے۔ مومن کی فلم بھی صرف پیسے کے لیے ہی کرنا چاہتی تھی۔

ورنہ متاثر نہیں ہوں اُس سے میں۔“ وہ کہے بغیر رہ نہیں سکی۔

”پیسہ چاہیے تھا جہانگیر کے لیے اسی لیے داؤد اور میں نے کوشش کی تھی کہ یہ فلم مل جائے تمہیں

مگر تم نے..... کل کو پچھتاؤ گی کہ موقع ملا تھا اور تم نے ضائع کر دیا۔“ مومنہ اُس کے جملے پر جھاگ کی طرح

بیٹھی تھی۔

”کیا کروں معافی مانگ لوں؟“ وہ بے اختیار اُبھی اور اقصیٰ بے یقینی سے اُس کا چہرہ دیکھنے

لگی۔

”وہ ”مومن“ ہے کینہ رکھتا ہے۔ بدلہ لیتا ہے معاف نہیں کرتا..... اور وہ بھی اب۔“

”مجھے جانا ہے اقصیٰ ابا انتظار کر رہے ہیں ہاسپٹل میں..... جہانگیر کا ڈائلا سز ہے آج۔ تم سے

کچھ پیسے چاہئیں تھے۔“ اُس نے اقصیٰ کی بات کاٹی اور اُس سے اپنا مسئلہ کہا۔ آخری جملہ ہمیشہ کی طرح

نظریں ملائے بغیر۔ قرض مانگنے والا کیا نظر ملاتا کیا نظر اُٹھاتا۔

”گھنٹہ بک بک سنی میری۔ سیدھا نہیں کہہ سکتی تھی پہلے ہی۔“ اقصیٰ نے اپنا پرس کھولتے ہوئے

اُسے ڈانٹا۔ وہ اُس کی ہر ڈانٹ ہر جھڑک سن سکتی تھی۔ چینی کی طرح وہ اس بھری دُنیا میں خاندان کے باہر

اُس کا خاندان تھی جس سے وہ سب کہہ لیتی تھی سب مانگ لیتی تھی اور جس کے سامنے وہ ”رو“ لیتی تھی۔ پتا

نہیں اُدھار کا وہ کون سا کھاتہ تھا جو دوستی کے کاروبار میں چلتا ہے۔ ہندسوں میں کوئی لین دین رکھا ہی نہیں جاتا اُس میں سب احسان کی زبان میں درج ہوتا ہے۔ قدر کی زبان میں وصول ہوتا ہے۔ اقصیٰ مومنہ سلطان کی غم گسار، غم خوار تھی اُس پر جان چھڑکنے والی دوست اور وہ مومنہ سلطان حیران ہوتی تھی کہ وہ کس صلے کی توقع میں اُس کے ساتھ تھی۔ وہ بھی اُس کی طرح سائیڈ رولز کرتی تھی۔ کالج میں اُس کی کلاس فیلو بھی رہی تھی۔ اُس کی زندگی کے مسائل مومنہ سلطان جیسے نہیں تھے۔ کم تھے اور اُس کی زندگی میں ایک داؤد بھی تھا جو مومنہ سلطان کی زندگی میں نہیں تھا۔

وہ دونوں انگیڑ تھے اور دونوں اپنی شادی کے لیے پیسے جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ داؤد قلبِ مومن کا اسٹنٹ تھا اور کالج میں اُن کی چوکور کا تیسرا کونا۔ اقصیٰ سکول کے زمانے سے اکیٹنگ کر رہی تھی کیوں کہ اُسے اپنے باپ کی وفات کے بعد تین چھوٹے بھائیوں کو پڑھانا اور ماں کا سہارا بنانا تھا اور داؤد اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر میں بچپن سے اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد رہتا تھا۔ اور اُن کے ساتھ تیسری مومنہ سلطان تھی جسے اس دوستی کے آغاز میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ انٹر میں آرٹ پڑھنے آئی تھی۔ جہانگیر چائلڈ سٹار کے طور پر بہت اچھا کمار ہا تھا اور سلطان اور ثریا کو بھی تھوڑا بہت کام ملتا رہتا تھا۔ زندگی تب مومنہ سلطان کے لیے اچھی تھی اور زیادہ اچھی چوکور کے اُس چوتھے کونے کی وجہ سے ہوئی تھی جس کا نام فیصل تھا۔

مگر پھر سب کچھ بدل گیا تھا اور جو بھی بدلاتا تھا وہ صرف مومنہ سلطان کے لیے بدلاتا تھا۔ اقصیٰ اور داؤد کی زندگی کے مسئلے تو شروع ہی سے ویسے ہی تھے وہ نہ بڑھتے تھے نہ کم ہوتے تھے اور مومنہ کی زندگی میں جہانگیر کی بیماری تباہی کی طرح آئی تھی اور فیصل اُس کی زندگی وہ نخلستان تھا جہاں بسنے کے خواب مومنہ دیکھتی رہی تھی۔ نخلستان نخلستان ہی رہا تھا لیکن بس صحرائیں سراب کی طرح ہو گیا تھا۔



اُس نے برآمدے میں کھڑے سلطان کو دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ سلطان نے بھی بالکل اُسی وقت اُسے دیکھا تھا۔ مومنہ کو وہ کچھ اضطراب میں لگا تھا۔ لنگڑاتا ہوا وہ مومنہ کی طرف بڑھا اور اُس نے کہا۔

”کب سے انتظار کر رہا ہوں تمہارا مومنہ، ڈاکٹر بھی چلا گیا۔“ سلطان نے اُس کے قریب

آتے ہی کہا۔

”چلا گیا، لیکن آپ نے تو بات کرنی تھی گردہ لینے کی۔“ مومنہ نے کہا۔

”ہاں کی ہے میں نے بات۔ وہ کہہ رہا تھا پیسے لے آؤ تو مل جائے گا گردہ..... matching بھی ہو جائے گی پر بغیر پیسوں کے بار بار گردہ لینے کی بات نہ کروں میں۔“ مومنہ کو پتا تھا ڈاکٹر کے انداز میں کیسی بے زاری ہوگی۔ وہ ہر بار جہانگیر کا ڈائلا سز کروانے آتے تو اسی طرح کی گفتگو ہوتی تھی اُن کے درمیان۔

”کتنے پیسے لگیں گے گردہ ٹرانسپلانٹ ہونے پر؟“

(یوں جیسے وہ گولڈ کاریٹ تھا جو ہر ہفتے بدل جاتا تھا۔)

”پانچ، چھ لاکھ۔“ وہ ڈاکٹر رٹے رٹائے انداز میں جواب دیتا۔

”match تو ہو جائے گا نا۔“ سلطان پوچھتا۔

(یوں جیسے وہ کپڑے کا وہ تھاں کھلوا کر دیکھ رہا ہو جسے خریدنے کی ہمت نہ ہو رہی ہو۔)

”پیسے ہوں گے تو سب match ہو جاتا ہے۔ یہاں خالی خالی باتوں کا کیا فائدہ۔“ ڈاکٹر جواباً

اُن سے کہتا۔

”کوئی نقصان تو نہیں ہوگا نا جہانگیر کو نئے گردے سے۔“ سلطان کو تشویش ہوتی۔

(یوں جیسے پہلے پرانے گردے کے ساتھ جہانگیر جنت میں جی رہا تھا۔)

”اُس کا نصیب۔“ ڈاکٹر وہ جواب دیتا اور سلطان کے سارے سوال ختم ہو جاتے اور اس

ساری گفتگو کے دوران مومنہ خاموش تماشائی کی طرح کھڑی رہتی۔ ڈاکٹر اُس سے کچھ بے تکلفی دکھاتا کچھ flirtatious ہوتا۔ وہ جانتا تھا وہ اداکارہ تھی جس کا مطلب معاشرے کے ہر شخص کی طرح وہ بھی یہی لیتا تھا کہ وہ آسانی سے ”دستیاب“ تھی اور کردار پر سوالیہ نشان لیے ہوئے بھی تھی۔

مومنہ ڈاکٹر کی ”ان“ نظروں کو نظر انداز کرتی مسکراتے ہوئے اُس کی ذومعنی باتوں کو سنی ان سنی کرتی ڈھٹائی سے ہنستی اور ڈاکٹر کے اس خیال کی تصدیق کرتی کہ ہر اداکارہ کریکٹر لیس ہوتی ہے۔ آسانی سے دستیاب ہونے والی بدکردار عورتیں۔

اور مومنہ سلطان اُس harrasment کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھی اور اُس کے ساتھ ساتھ سلطان بھی۔ اُس ہاسپٹل میں اُس ڈاکٹر کے طفیل جہانگیر کو زندگی کی بوندیں مل رہی تھیں۔ قطرہ قطرہ، تو اُس کے سامنے مومنہ سلطان حیا اور شرافت کا ڈھنڈورا کیا پیٹتی۔ وہ اُس کے بھائی کا مسیحا تھا۔ اُس کی جان بھی لے لیتا تو وہ دے دیتی یہ تو معمولی سی ذلت تھی جو وہ کسی بس سٹاپ پر کھڑے کسی لوہر لفنگے کے ہاتھوں بھی برداشت کر لیتی تھی۔ یہ تو پھر اُس کے بھائی کا علاج کروانے والا ”کوالیفائیڈ“ ڈاکٹر تھا۔

”جہانگیر کا ڈائلا سز ہو گیا؟“ اُس نے سلطان کے چہرے پر جیسے کوئی اچھی خبر ڈھونڈنا چاہی۔
 ”ابھی ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ اور test لکھ دیے ہیں۔“ سلطان نے کچھ کاغذ اُس کی طرف
 بڑھاتے ہوئے کہا۔ مومنہ نے کچھ کہے بغیر وہ کاغذ پکڑ لیے۔ سلطان اندر چلا گیا تھا۔ مومنہ وہیں کوریڈور
 میں پڑی ایک بنچ پر ایک بوڑھی عورت کے برابر بیٹھ گئی جو تسبیح پڑھ رہی تھی۔

”ڈائلا سز ہے کسی کا؟“ اُس کے بیٹھے ہی مومنہ سے اُس نے پوچھا تھا۔

”ہاں.....“ مومنہ نے مدہم آواز میں کہا۔ اُن کاغذات پر لکھے tests کا مطلب تھا مزید قرض
 اور مومنہ کو سوچنا تھا کہ فوری قرض وہ اب اور کس سے لے سکتی تھی۔

”کس کا؟“ عورت نے اُس کی عدم دل چسپی کی پروا کیے بغیر اُس سے پوچھا تھا۔

”بھائی کا۔“ اُس نے پھر مختصر جواب دیا۔

”جو ان ہے؟“ عورت نے تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ اس بار چند لمحے خاموشی رہی۔ مومنہ نے سکون کا سانس لیا۔ اُن سوالوں کے رکنے

پر۔

”میرا بھی بیٹا ہے ڈائلا سز پر۔ پہلے بڑے والے کا گردہ فیل ہوا پچھلے سال۔ اب چھوٹے
 والے کا۔“ مومنہ نے بے اختیار سر اٹھا کر اُس عورت کو دیکھا جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں سب ہی کی ایسی ہی
 کہانیاں تھیں لیکن وہ پھر بھی اُس عورت کے لیے دُکھی ہوئی تھی۔

”تو بڑے والا؟“ مومنہ کو سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا سوال کرے اُس کے بڑے بیٹے کے بارے میں،

لیکن اُس عورت نے جیسے اُس کا سوال بھانپ لیا تھا۔

”اُسی کے لیے تسبیح کر رہی ہوں۔ آج برسی ہے اُس کی۔ بس اب دُعا کرنا کہ چھوٹے والا بچ
 جائے۔ ایک ہی رہ گیا ہے نا۔“ کسی نے جیسے مومنہ کی پسلی میں کچھ دے مارا تھا۔ سانس ہی نہیں لی گئی اُس
 سے۔ اُس کا بھی تو ایک ہی بھائی تھا اور وہ اُس کے لیے اس عورت کی طرح تسبیح نہیں پڑھنا چاہتی تھی۔
 کاغذ پر لکھے ہوئے سارے test کے الفاظ اب آپس میں گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ دن میں کہی ہوئی اقصیٰ
 کی بات اُسے ایک بار پھر یاد آئی تھی۔

”کیسا موقع گنوا یا تم نے مومنہ..... زندگی بھر پچھتاؤ گی تم۔“ اُس کا دل چاہا وہ وہاں سے اُٹھے

اور بھاگنا شروع کر دے۔ بھاگتی جائے بھاگتی جائے یہاں تک کہ سب کچھ کہیں بہت پیچھے رہ جائے۔

”تم کہاں جا رہی ہو بیٹا؟“ اُس بوڑھی عورت نے یک دم پوچھا۔ اُس نے ہاتھ سے دور

”ابا آرہے ہیں شاید میرے بھائی کا ڈائیلاز ہو گیا۔“ سلطان کی چال میں لنگڑاہٹ اُس ہاسپٹل میں آکر ہمیشہ بڑھ جاتی تھی۔ وہ پاؤں میں پائے جانے والے نقص کو اُس نے زندگی میں کبھی گردانا نہیں تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں آکر خواخواہ ہی اُسے لنگڑے کا لیبل دے رہا تھا حالاں کہ یہ اُس کی ٹانگ کا لنگ نہیں تھا اُس کے بیٹے کی بیماری کا بوجھ تھا جو اُسے دو قدموں پر متوازن ہو کر چلنے نہیں دیتا تھا۔ پُر اُس نقص کے ساتھ اُس عمر میں بھی وہ جہانگیر کے ساتھ ہسپتالوں میں دوڑا پھرتا تھا۔

مومنہ کھڑی باپ کو دیکھتی رہی جو اُس کے قریب پہنچنے سے پہلے اپنے سارے آنسو پونچھ لینا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اور مومنہ وہ رونا چاہتی ہی نہیں تھی۔ اُسے لڑنا تھا جہانگیر کی زندگی کے لیے۔



ایک بہت بڑے کینوس پر ایک بوڑھا ہاتھ ایک آیت لکھ رہا تھا ویسی اُسی دودھیا روشنی میں۔

(سورۃ فاطر ۵)

فلا تفرنکم الحیوة الدنیا۔

فضا میں اُس آیت کو کوئی بے حد خوش الحانی سے پڑھ رہا ہے۔ وہ بوڑھا ہاتھ اُس آیت کو مکمل کر لیتا ہے تو یک دم وہ خوب صورت خوش الحان مردانہ آواز بھی بند ہو جاتی ہے جو اس آیت کی تلاوت کر رہی تھی۔ آسمان سے پڑنے والی روشنی اب اُس کینوس کے پارسفید لباس میں ملبوس ایک عورت کو whirling Darvesh کی طرح گول چکر کاٹتے ہوئے رقص کرتی ایک عورت پر پڑتی ہے جو ایک نقطے کے برابر نظر آرہی ہے۔ تیز گھومتا ایک نقطہ اور پھر اُس نقطے کا سائز بڑھتا بڑھتا ایک عورت کے وجود میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ وہ اب اتنی تیز رفتاری سے گول چکر کاٹ رہی ہے کہ اُس پر نظر جمانا مشکل ہو گیا ہے اور پھر وہ رقص کرتا وجود آگ کے شعلے میں تبدیل ہو جاتا ہے یوں جیسے جل اٹھا ہو اور پھر یک دم تاریکی چھا جاتی ہے۔

مومن اپنے بستر پر ہڑبڑا کر اٹھتا ہے۔ کمرانیم تاریک تھا اور اُس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ ناہموار سانسوں اور کانپتے ہاتھوں سے اُس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل لمپ آن کیا۔ وہ خواب بڑے عرصے بعد اُس نے دیکھا تھا اور ہر بار کی طرح اس بار بھی اُس خواب کو دیکھنے کے بعد وہ کانپتے ہوئے عجیب سی ہیبت کے عالم میں جاگا تھا۔ نہ وہ اُس بوڑھے ہاتھ کو پہچان پارہا تھا نہ اُس جگہ کو نہ اُسی روشنی کو نہ اُن آیات اور اُن کے مفہوم کو اور نہ ہی اُس درویشوں کے لباس میں رقص کرتی ہوئی عورت کو..... مگر اس کے باوجود وہ خواب بچپن سے جیسے اُس کے تعاقب میں رہتا تھا۔ ہر بار کینوس کی آیات بدلتی تھیں۔ پر وہ بوڑھا ہاتھ وہی

رہتا تھا۔ ہر بار خواب میں رقص کرنے والا بدلتا تھا۔ کبھی وہ ایک مرد ہوتا تھا، کبھی وہ ایک عورت اور قلبِ مومن دونوں کے چہرے پہچاننے کی جستجو میں انہیں شعلوں میں تبدیل ہوتا غائب ہوتا دیکھتا رہتا تھا، مگر ہر بار کچھ بھی نہ پہچاننے کے باوجود وہ جیسے یہ جان جاتا تھا کہ اُس نے اُس خواب میں کس کو دیکھا تھا۔ جیسے وہ اس رات جان گیا تھا۔

اُس کا سر اس وقت شدید درد سے پھٹ رہا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اُٹھ کر واش روم گیا تھا۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اُس نے جیسے اُس درد سے لڑنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ واپس کمرے میں آکر اُس نے گلاس میں پانی ڈالا اور پھر سردی دو گولیاں پھانکیں۔ جب تک اُس کا درد کم نہیں ہوتا وہ دوبارہ سو نہیں سکتا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور اُس کے کمرے کے شیشوں کی دیواروں سے کراچی کی روشنیاں رات کے اس پہر بھی نظر آرہی تھیں۔ وہ کچھ دیر گلاس وال کے سامنے کھڑا رات کی تاریکی میں ڈوبے شہر کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے پلٹ کر اپنے کمرے کی الماری میں سے ایک پرانی البم نکالی تھی۔ وہ البم لے کر صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔

پہلا صفحہ پلٹتے ہی ایک بے حد خوب صورت لڑکی ایک چھ ماہ کے بچے کو گود میں لیے ہوئے تھی۔ اُس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں بھی اُس لڑکی کے تیکھے نقوش اور خوب صورت آنکھیں کسی کی نظر کو بھی اُلجھا سکتی تھیں۔ قلبِ مومن کی آنکھوں میں جیسے نمی آئی تھی۔ اُس نے اگلا صفحہ پلٹا پھر اگلا۔ ہر تصویر میں وہ لڑکی اسی بچے کے ساتھ تھی پر اب وہ بچہ چھ ماہ کا نہیں تھا وہ آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا اور پھر کئی صفحات بعد وہ پہلی تصویر آئی تھی۔ جو ایک بے حد خوب و مرد کی تھی۔ کوئی قلبِ مومن کو دیکھتا اور اُس تصویر کو تو کوئی رشتہ جوڑے بغیر نہ رہ پاتا۔

قلبِ مومن نے اگلا صفحہ پلٹا تھا۔ وہ اُس البم کا آخری صفحہ تھا۔ جس پر اُسی لڑکی، مرد اور بچے کی تصویر تھی۔ وہ اُن تینوں کی اکٹھے کھینچوائی گئی آخری تصویر تھی۔ جس میں اُس مرد اور عورت کے درمیان وہ سات سال کا بچہ کھڑا تھا۔ اُن دونوں کے ہاتھ پکڑے یوں جیسے زنجیر ہو مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا طلحہ عبدالعلی اور حسن جہاں کی اس خوب صورت داستان کا خاتمہ اُس کڑی سے ہوا تھا جو اُن دونوں کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ وہ قلبِ مومن تھا..... طلحہ عبدالعلی اور حسن جہاں کی اکلوتی اولاد۔



ندیم صاحب نے تو جہانگیر کو دیکھتے ہی کہا تھا کہ میں اس میں ایک اور وحید مراد دیکھ رہا ہوں۔ یہ بچہ بڑا ہو کر ایک اور چاکلیٹ ہیرو بنے گا۔“

”مانتے ہی نہیں تھے کہ میرا بیٹا ہے۔ مذاق کرتے تھے کہ کہاں سے اُٹھلائے ہو تم لوگ یہ نواب کی اولاد۔“ سلطان اپنی بات کہہ کر خود ہنسا تھا اور اُس کے ہنسنے پر ثریا اور جہانگیر بھی۔ مومنہ اپنے لیے ٹرے میں کھانا لے کر اندر آئی تھی اور ہزاروں بار سُنے ہوئے وہ جملے اُس نے ایک بار پھر سُنے تھے۔ وہ ساری گفتگو ہر اُس رات ہوتی تھی جب جہانگیر کا ڈائیلاز ہوتا تھا۔ پتا نہیں ثریا اور سلطان جہانگیر کا حوصلہ بحال کرنا چاہتے تھے یا اپنا۔ وہ اُن کی باتیں سنتے ہوئے کھانا لے کر کمرے میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

اُس کمرے کی دیواروں پر سستی لکڑی کے لگے ریکس جہانگیر کے ایوارڈز، شیلڈز اور ٹرافیوز سے بھرے پڑے تھے اور اُن میں کہیں وہ سونے کا پانی چڑھے ہوئے تاج بھی تھے جو وقتاً فوقتاً چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر اُس کی رسم تاج پوشی کے دوران مختلف پریس کلبز اور ادبی تنظیمیں کیا کرتی تھیں اور جہاں جہانگیر کے بچپن میں ثریا اور سلطان بڑے شوق سے جایا کرتے تھے اور وہ بھی۔ اُسے تالیاں بجانے کا بے انتہا شوق تھا جہانگیر کے لیے اور سیٹیاں بھی جو بجاتا اُس نے سلطان سے سیکھا تھا اور پھر ہر تقریب کے بعد سب انعام یافتہ افراد کا گروپ فوٹو اور پھر جہانگیر اور اماں ابا کے ساتھ اُس کا فیملی فوٹو جسے فوٹو گرافرز اُس وقت سلطان اور ثریا کے اصرار پر کھینچتے تھے مگر بعد میں اخبار میں تصویر صرف جہانگیر ہی کی لگتی۔ وہ تینوں اُس میں سے حذف کر دیے جاتے۔ وہ پاکستان کا سب سے مہنگا چائلڈ آرٹسٹ رہا تھا۔ مہنگا اور talented

مومنہ اُس کے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ دیواروں پر لگی اُن تصویروں کو دیکھتی رہتی تھی جو اُن سپر سٹارز کے ساتھ جہانگیر کی تھیں جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے زمانہ ترستا تھا۔

”اماں جب میں ٹھیک ہو جاؤں گا تو پھر اکیٹنگ کروں گا۔“ اُس نے جہانگیر کو کہتے سنا اور وہ نوالہ لینا بھول گئی۔

”ہاں..... ان شا اللہ..... اور اس بار تو بیسٹ ایکٹر کا ایوارڈ لینا ہے میرے بیٹے نے۔“ ثریا نے جیسے اُس کے خواب کی پینگ بڑھائی جہانگیر اور مومنہ کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرا دی۔

”آپا کو تو جس دن سے فلم نہیں ملی موڈ ہی آف ہو گیا ہے ان کا۔“ اُس نے مومنہ کو چھیڑا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ چاہتا تھا وہ کچھ بولے۔

”تمہارا اور میرا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ دیکھو اُس دیوار پر میرا ایک بھی ایوارڈ نہیں ہے۔ سارے ایوارڈز ساری شیلڈز تمہاری ہیں۔“ مومنہ نے جیسے اُس ڈرامے میں اپنا رول پلے کرنا شروع کیا جو وہ سب مل کر جہانگیر کے لیے کرتے تھے۔

”ہاں یہ تو ہے لیکن تم بھی میری طرح چائلڈ آرٹسٹ بن جاتی تو میرے جتنے نہیں لیکن کچھ نہ کچھ ایوارڈز تو جیت ہی لیتی تم۔“

وہ جواباً اُس ڈرامے میں اپنا رول ادا کرنے لگا تھا۔

”ارے اس کا بس چلے تو یہ تو آج بھی نہ کرے اداکاری۔ یہ کہاں قدر جانتی ہے ایکٹنگ کی، آرٹسٹ کی۔“ ثریا نے مداخلت کی۔ مومنہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ سلطان کو حسن جہاں یاد آگئی۔

”حسن جہاں قدر کیا کرتی تھی آرٹسٹوں کی۔“ مومنہ نے یک دم کھانے کی ٹرے اٹھائی اور کمرے سے نکل گئی۔

”پتا نہیں ابا کو ہر بات پر حسن جہاں کیوں یاد آ جاتی ہے۔“ اُس نے جیسے چڑ کر سوچا تھا۔

”اور اب گھنٹوں اُس کی مثالیں دیتے رہیں گے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے ابا کو حسن جہاں سے محبت تھی صرف کام نہیں کرتے تھے اُس کے ساتھ اور اماں..... اماں جہانگیر کے عشق میں مبتلا ہیں اور میں؟ میں ان سب کے۔ ہم سب دائروں میں چل رہے ہیں۔ کوئی دائرہ کسی دوسرے دائرے سے ملتا ہی نہیں۔“ برآمدے کے تخت پر بیڈ پر کھانا کھاتے ہوئے اُس نے برآمدے کی کھلی کھڑکی سے نظر آتے جہانگیر ثریا اور سلطان کی ٹکون کو دیکھا۔ وہاں جیسے اُس کی کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ مگر مومنہ سلطان کو اس کی بھی شکایت نہیں تھی۔ وہ اُن کے گھر کا ”ہیرو“ تھا اور فلم انڈسٹری صرف ہیرو کی پرستش کرتی تھی۔ اُس کے ماں باپ کا خواب تھا اُس فلم انڈسٹری میں ایک ”ہیرو“ اُن کے خاندان سے بھی ہوتا۔ مومنہ سلطان کے لیے انہوں نے کبھی ایسا خواب نہیں دیکھا تھا۔ اُسے ضرورت اور مجبوری اُس میدان میں لے آئی تھی۔ جہاں کے کانٹے صرف عورت کے پیروں کو زخمی کرتے تھے۔

☆.....☆.....☆

”آئینہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ میں تم سے اور تم کسی اور سے۔ تینوں پاگل ہیں اور تینوں خالی ہاتھ رہیں گے۔“ قلب مومن اپنے سٹوڈیو میں رات کے اس پہر آڈیشنز کی فوٹیج دیکھنے میں مصروف تھا اور اسکرین پر اس وقت مومنہ سلطان کے اُس نامکمل آڈیشن کی فوٹیج چل رہی تھی۔ وہ غضب کی ایکٹریس تھی۔ کمال کا eye contact تھا اُس کا کیمرہ اور کیمرے کے ذریعے دوسری طرف بیٹھی audience کے ساتھ۔ اُس کے تاثرات بے حد جان دار تھے اور ڈائلاگ ڈیلیوری اور آواز قاتل۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اُس کے آڈیشن کی فوٹیج پر آ رہا تھا۔ اُس آڈیشن کی فوٹیج کو جسے اُس کا گرتا دوپٹا بھی خراب نہیں کر پایا تھا۔ اُس کا فٹ ورک بہترین تھا۔ وہ فریم میں تھی اور فریم میں ہی رہی تھی۔ اداکاری

اُس کے لیے جیسے خالہ جی کا گھر تھا۔

اُس کے آڈیشن کو دیکھتے ہوئے قلبِ مومن کے ذہن میں اُس کے ساتھ ہونے والی پوری ملاقات گھومی تھی۔ وہ اگر اتفاقاً اس فوٹج کو نہ دیکھ لیتا تو شاید اُس ملاقات کے بعد مومنہ سلطان اُسے کبھی یاد تک بھی نہ رہتی مگر اس وقت وہ ہر دس پندرہ منٹوں کے بعد نئی ایکٹریز کے آڈیشن دیکھنے کے بعد دوبارہ اُس کے آڈیشن پر آجاتا۔ اُن درجنوں اسٹالنش اور خوب صورتی اور گلیمر کے معیار پر ہر لحاظ سے پورا اُترنے والی لڑکیوں میں سے اُسے کوئی ایک ”اداکارہ“ نظر نہیں آئی تھی۔ فوٹج کو آخری بار دیکھ کر اُس نے اُسے delete کر دیا تھا۔ یہ کام اُس نے داؤد کے ذمہ لگایا تھا مگر داؤد شاید دانستہ طور پر اُسے یہی موازنہ اور مقابلہ دکھانا چاہتا تھا جو وہ اس وقت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کر رہا تھا مگر اس کے باوجود مومنہ کے لیے اُس کی فلم میں کوئی گنجائش پیدا نہیں ہوئی تھی۔



گہری نیند میں مومنہ کو یوں لگا تھا جیسے اُس کی آنکھ کسی کھٹکے سے کھلی تھی۔ اُس نے غنودگی کے عالم میں آنکھیں کھولے کمرے کو دیکھا تھا۔ ثریا سو رہی تھی برابر کے بستر پر۔ وہ اپنی چادر اُتارتے ہوئے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے جہانگیر کے کمرے سے کچھ آوازیں آئی تھیں۔ اپنے کمرے سے نکل کر اُس نے صحن میں چارپائی پر گہری نیند سوئے سلطان کو دیکھا پھر وہ جہانگیر کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ جاگا ہوا اپنے بستر پر بیٹھا تھا اور اُس کا بستر اُس کے ایوارڈز سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے سر اُٹھا کر مومنہ کو دیکھا تھا۔ وہ بھی اُسے دیکھتی رہی پھر پاس چلی آئی۔

”کیوں جاگ رہے ہو جہانگیر؟ کچھ چاہیے؟“ وہ گُرسی پر اُس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

”آپا تم مجھے مرنے نہ دینا۔“ عجیب بے بسی کی کیفیت میں اُس نے مومنہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں عجیب خوف تھا۔

”تم مجھے بچا لینا۔“ وہ اُس کے ہاتھ بھینچے ہوئے اُس سے کہہ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اُسے دیکھتی رہی پھر اُس نے جہانگیر کو لپٹا لیا۔

”نہیں مرنے دوں گی۔“ اُس نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اُس کے سینے میں منہ چھپائے ہوئے سسک رہا تھا اور اُس کے بستر پر ہر طرف اُس کا ”عروج“ پڑا ہوا تھا۔



”مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی مومنہ۔“ اقصیٰ نے اُسے ہونق نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ صبح سویرے

اُس کے گھر پر تھی اور اُس کی درخواست سُن کر اقصیٰ کو لگا تھا وہ پاگل ہو گئی تھی۔

”مجھے خود بھی اپنی سمجھ نہیں آتی۔“ وہ چائے کا کپ اپنی گود میں رکھے اُس کے بستر میں بیٹھی

بڑبڑاتی تھی۔

”تم مومن کو سمجھتی کیا ہو آخر؟ تم جاؤ گی اُس کے پاس اور وہ تمہاری معذرت قبول کر کے رول

دے دے گا تمہیں..... All good.....“ اقصیٰ نے جھنجھلاتے ہوئے اُس سے کہا۔

”ایک کوشش کر لینے میں کوئی ہرج تو نہیں۔“ مومنہ اپنی بات پر مصر تھی۔

”وہ تمہیں رول نہیں دے گا۔ میں تمہارے سامنے وہ باتیں دہرانا نہیں چاہتی جو اُس نے

تمہارے بارے میں داؤد سے کی تھیں۔ تم کیوں بے عزت ہونا چاہتی ہو؟“

”مجھے اس وقت شہرت اور پیسے کی ضرورت ہے اقصیٰ..... عزت اب ترجیح نہیں رہی میری۔ تم

ایک دفعہ داؤد سے کہو مومن سے میری ملاقات کروادے۔ بس ایک بار۔“ وہ منت بھرے لہجے میں کہہ رہی

تھی اور اقصیٰ اُس کے اس لہجے کے سامنے ٹکی نہیں رہ سکتی تھی۔

”تم چاہتی ہو داؤد بے روزگار ہو جائے اور ہماری شادی پھر لٹک جائے تو ٹھیک ہے۔ دوستی

کے نام پر یہ بھی سہی۔“ اُس نے تن فن کرتے ہوئے فون اٹھا کر داؤد کا نمبر ملانا شروع کر دیا تھا۔ مومنہ

چپ چاپ اُسے دیکھ رہی تھی۔



قلب مومن کا پیٹ ہاؤس میوزک کی تیز آواز سے گونجتے ہوئے ٹیرس پر بنے ڈانس فلور پر

تھرکتی سپاٹ لائٹس کی رنگین روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ ویسی ہی معمول کی ایک پارٹی تھی جس کے لیے

وہ پیٹ ہاؤس مشہور تھا۔ ویٹرز ہارڈ اور سافٹ ڈرنکس سرو کرتے ہوئے ٹیرس پر بنے اُس بار میں آ جا رہے

تھے جو بوقتِ ضرورت بار بی کیو ایریا کے طور پر بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ ایک مختلف انواع کا میوزک

بجاتے ہوئے ماحول کو گرمائے ہوئے تھا اور ہر بدلتے میوزک کی بیٹ پر ڈانس فلور پر جوڑے تھرک رہے

تھے۔ مہمانوں کی آمد و رفت جاری تھی اور وہاں موجود کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو ایک دوسرے سے واقف نہ

ہو۔ پاکستان ٹی وی، ماڈلنگ اور فلم انڈسٹری سے منسلک اپنی اپنی فیلڈ کے بہترین ناموں میں سے تھے اور

وہ سب وہاں قلب مومن کی فلم کی کامیابی اور اُس کے ایوارڈ کو سیلبریٹ کرنے آئے ہوئے تھے۔ شو بز کی

فیلڈ سے منسلک کوئی ایسا بڑا سٹار نہیں تھا جو اس وقت وہاں نہ ہوتا۔ قلب مومن کے invitation کو کوئی

رد کرنے کی جرأت کر نہیں سکتا تھا اور اُس کی نظروں اور good books میں رہنا اس وقت ہر ایک سٹار اور

ایکٹریس کی ضرورت تھی یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اپنی کسی فلم میں main lead کو دوبارہ کاسٹ نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت سے بڑے برانڈز کی کمرشل فلمز بھی شوٹ کرتا تھا اور قلبِ مومن اُن کمرشلز میں صرف اُن ہی کو لیتا تھا جنہیں وہ چاہتا تھا۔ برانڈز کے مطالبات کو وہ اکثر نظر انداز کرنے کا عادی تھا اور اُس کا ہر کمرشل ٹی وی اور ڈیجیٹل اسکرین پر دھوم مچانے کی تاریخ رکھتا تھا۔ تو قلبِ مومن کے نخرے اگر برانڈز نہ اٹھاتے تو کیا کرتے اور ایکٹرز اُس کے آگے پیچھے نہ پھرتے تو کیا کرتے۔

قلبِ مومن اس وقت داخلی دروازے کے پاس مہمانوں کے استقبال کے لیے نہا کے ساتھ موجود تھا اور نہا وہاں پر بالکل ایک میزبان کا کردار ادا کر رہی تھی۔ قلبِ مومن کی گرل فرینڈ کے طور پر وہ شو بز کے حلقوں میں اب بڑی اچھی طرح متعارف ہو چکی تھی اور قلبِ مومن کی گرل فرینڈ کے لیبل کو اُس نے ایک ڈیزائنرز کے طور پر اپنے بزنس کو پھیلانے اور clientale کو بڑھانے کے لیے بہترین طریقہ سے استعمال کیا ہے۔ اُس کے پاس آنے والوں میں اب انڈسٹری کی ہر بڑی ایکٹریس اور ماڈل شامل تھی جو اُس کے ذریعہ قلبِ مومن کی رسائی پانے کے متمنی تھے اور نہا بڑی چالاکی اور ذہانت سے اُن کی اس خواہش کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ شو بز جیسا بزنس کوئی اور نہیں ہوتا۔

اس سارے ہنگامے میں لاؤنج میں لگی ہوئی وہ خطاطی کسی عینی شاہد کی طرح اُس دیوار پر استارہ تھی جس کے نیچے بڑے صوفوں میں نیم برہنہ ماڈلز اور ایکٹرز سبز شراب کے گلاسز ہاتھ میں لیے مخمور بیٹھی تھیں یا پھر چل پھر رہی تھیں۔

”مومن یہ ضوفی ہے میں نے اسے انوائٹ کیا تھا تمہیں ملوانے کے لیے۔“ وہ لمبے قد کا کسرتی جسم رکھنے والا مناسب شکل و صورت کا ایک نوجوان لڑکا تھا جسے نہا نے قلبِ مومن سے ملوایا تھا۔ قلبِ مومن نے کسی رد عمل کے بغیر اُس کا استقبال کرتے ہوئے خوش دلی سے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”آپ سے پہلی بار ملاقات ہو رہی ہے۔“ ضوفی نے جواباً بے حد نروس انداز میں مومن سے کہا۔

”ہاں But I am a huge fan.“ اُس نے بے حد گرم جوشی سے قلبِ مومن سے مصافحہ کیا تھا۔ وہ جو سکُن ٹائٹ ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اُس کی مختصر آستینیں اُس کے biceps کو اور اُس کا V گلا اُس کے سینے کے مسلسل کوڈسپلے پر رکھے ہوئے کسی شو پیس کی طرح دکھا رہی تھی۔

”Thank you.“ مومن مسکرایا تھا لیکن اُس نے ضوفی میں زیادہ دل چسپی نہیں لی تھی۔ وہ کسی اور کی طرف متوجہ ہونے والا تھا جب نہا نے ایک بار پھر اُسے ضوفی ہی کی طرف متوجہ کیا۔

”ضوفی نے ابھی ابھی ماڈلنگ اور ایکٹنگ شروع کی ہے اور بڑا keep ہے وہ کسی فلم میں کام کرنے کے لیے۔“ مومن نے نیہا کی بات اب بھی دھیان سے نہیں سنی تھی اُس کی توجہ اپارٹمنٹ کے بار بار کھلنے والے دروازے پر مبذول تھی جہاں سے چند چند منٹوں کے وقفے سے کوئی نہ کوئی مہمان نمودار ہو رہا تھا۔

نیہا اور ضوفی نے اُس کی عدم توجہ بیک وقت نوٹس کی اور ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر نیہا نے جیسے کوشش نہ چھوڑتے ہوئے اُس سے دوبارہ بات کا آغاز کیا تھا۔

”میں سوچ رہی تھی مومن اگر تم اپنی فلم میں.....“

”ایکسکوز می ڈیر۔“ اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کر پاتی مومن کسی مہمان کو آتا دیکھ کر نیہا کی بات سننے بغیر اُس کا بازو تھپکتے ہوئے چلا گیا تھا۔ ضوفی اور نیہا دونوں کچھ نادام سے ہوئے تھے۔ ضوفی نے نیہا سے کہا۔

”میں نے کہا تھا اُس سے پہلے بات کر لینا۔“ اُس کا لہجہ شکایتی تھا۔

”کر لوں گی یار ٹینشن کیوں لے رہے ہو؟“ نیہا نے جواباً اُس کا کندھا تھپکا۔

”ابھی کچھ دیر میں دوبارہ بات کرتی ہوں اُس سے۔ اُسے ذرا مہمان ریسیو کر لینے دو۔“ وہ اُسے لیے ہوئے ٹیرس کی طرف گئی۔

دو ایک جرنلسٹ کے ساتھ کھڑی شیلی نے تیکھی نظروں سے نیہا اور ضوفی کو دیکھا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی اُس کی نظروں کا مرکز نیہا اور مومن ہی رہے تھے۔

”You were like a goddess in this movies.“ اُس کے سامنے کھڑی Dusk کی فیچر رائٹر اُسے compliment دے رہی تھی۔ شیلی دوبارہ اُس کی طرف متوجہ ہوئی اور اُس نے اپنے بالوں کو تھپکا اور مسکرائی مگر اُس کی نظریں اب پھر نیہا پر تھیں جو ضوفی کو ٹیرس پر چھوڑ کر واپس مومن کے ساتھ کھڑی مہمانوں کو ریسیو کر رہی تھی۔

”ان کا کچھ چل رہا ہے کیا؟“ اُس جرنلسٹ نے شیلی کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔ شیلی ایک دم گڑبڑائی اور ہنسی۔

”No, no. Momin is very much single and available.“ شیلی نے

کہا۔

”But she is playing the host.“ جرنلسٹ نے اصرار کیا۔

”گرل فرینڈ ہے یار..... اور وہ تو مومن کی کئی ہیں۔“ شیلی نے دوبارہ کہا۔

”میں نے تو خبر لگائی تھی کہ مومن اور تم dating کر رہے ہو۔“ جرنلسٹ نے اس بار شیلی کو

چھیڑا وہ تہقہہ مار کر خوش دلی سے ہنسی۔

”اچھا میں نے نہیں پڑھی۔“

”ایسا سین ہے کیا؟“ جرنلسٹ نے گریدا۔

”Keep your fingers crossed.“ شیلی نے معنی خیز انداز میں اُس کو شہ دی۔ نیوز

میں سٹار بننے کے لیے انڈسٹری کے heart throb کے ساتھ کسی بھی حیثیت میں نہ رہنا ضروری تھا اور شیلی ایسے تعلقات کی ”افادیت“ پر یقین رکھنے والوں میں سے تھی۔

ناز نے دور کھڑے قلب مومن کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک اُبھرتی ہوئی ماڈل تھی اور ایک بڑے ایوارڈ شو میں بیسٹ ماڈل کا ایوارڈ جیت چکی تھی۔ اس وقت وہ ایک مشہور فیشن ڈیزائنر کے ساتھ قلب مومن کی اس پارٹی میں آئی تھی اور اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس فیشن ڈیزائنر کو dump کر کے قلب مومن کے ساتھ جا کھڑی ہوتی جو چند لمحے پہلے اُن دونوں کے ساتھ گپ شپ کر کے وہاں سے گیا تھا اور جس نے ناز کے نام نہاد لباس سے جھلکنے والے تمام اثاثہ جات پر کچھ زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ ناز جانتی تھی وہاں موجود سب خواتین وہاں اسی ”ڈسپلے“ کے لیے آئی تھیں۔ قلب مومن اپنی فلمز میں گلیمر کے علاوہ کچھ پیش نہیں کرتا تھا اور وہاں سب ”glamour“ کے سب تیرتلواروں سے لیس ہو کر آئی تھیں۔

”شیلی کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے مومن کا؟“ ناز نے اُس فیشن ڈیزائنر سے پوچھا جس کی

escort کے طور پر وہ آئی تھی۔

”شیلی!..... ہا ہا ہا۔“ وہ فیشن ڈیزائنر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

”Sheely is not Momin's type.“ اُس نے دور مومن کا بازو پکڑے کھڑی شیلی کو

دیکھتے ہوئے ناز کو تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

”اور وہ جو دوسری لڑکی ہے۔“ ناز نے نہا کو دیکھتے ہوئے گریدا۔

”گرل فرینڈ ہے مومن کی۔ اب دیکھو اُسے کب dump کرتا ہے۔ تم انٹر سٹڈ ہو رہی ہو

کیا؟“ اُس ڈیزائنر کو یک دم خیال آیا۔

”صرف فلم میں؟“ ناز نے گڑبڑا کر کہا۔

”اس کے کیرئیر کو یہاں تک پہنچانے میں اُس ڈیزائنر کا بہت بڑا ہاتھ تھا اور ناز کو اچانک خیال آیا تھا کہ اُسے یہ ساری معلومات اُس ڈیزائنر سے نہیں لینا چاہیے تھیں۔

”مومن میں loyalty نہیں ہے۔“ اُس ڈیزائنر نے جیسے ناز کے انکار کے باوجود اُسے خبردار کیا۔

”dump تو سب ہی کر دیتے ہیں یہاں کام نکلنے کے بعد لیکن مومن.....“ ڈیزائنر نے بے حد معنی خیز انداز میں جملہ اُدھورا چھوڑتے ہوئے ایک جتانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے گلاس سے سپ لیا۔

”میں تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“ ناز کو اُس فیشن ڈیزائنر کو اظہارِ محبت پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اُن کا تعلق اتنا ہی ”خالص“ تھا۔

اور قلبِ مومن کے بارے میں ایسے سوال و جواب کرنے والی ناز تنہا نہیں تھی اُس پارٹی میں۔ وہاں موجود ہر لڑکی اپنے آپ کو جیسے قلبِ مومن کی بھیڑ چڑھا دینے کے لیے تیار پھر رہی تھی۔ یہ محبت نہیں تھی، بزنس تھا شو بزنس۔ قلبِ مومن کا ساتھ اُن میں سے کسی کو بھی آسمان پر پہنچا دیتا۔ اُن تین ہیروئنز کی طرح جن کی زندگیاں قلبِ مومن کی فلمز نے بدلی تھیں اور آسمان کس کو اچھا نہیں لگتا تھا اور قلبِ مومن اس سب سے باخبر تھا۔ اپنی اہمیت سے، اپنی ضرورت سے، اپنے سٹار ڈم سے، ہر چیز سے وہ پھندوں میں پھنسنے والا نہیں تھا۔ دام میں آجانے والا سیّد بھی نہیں تھا۔ نہ جال میں قابو آتا تھا۔

”جان یہ میں تم سے ملواری ہی تھی ضوفی کو۔“ نیہا تیسری بار ضوفی کو مومن کے پاس لے کر آئی تھی اور یہ پہلا موقع تھا جب مومن نے ضوفی پر بالآخر غور کیا تھا۔ وہ اُسے اس طرح بار بار اُس کے پاس کیوں لا رہی تھی۔ چھوٹے موٹے ریفرنسز چلتے رہتے تھے لیکن اتنی desperation سے تو کبھی نیہا نے کسی کو اُس سے ملوانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مومن کو پہلی بار خیال آیا تھا۔

”ضوفی کی خواہش ہے تمہارے ساتھ کام کرنے کی۔“ وہ اب اُس سے کہہ رہی تھی۔

”خواہش نہیں خواب ہے سر..... آپ میرے آئیڈیل ہیں، آپ کی کامیابی پر مجھے رشک آتا ہے۔ آپ کے کام کا مجھ سے بڑا fan کوئی نہیں ہے پاکستان میں۔“ ضوفی نے اُس کی شان میں قلابے ملانا شروع کیے اور مومن نے اُسے درمیان میں ہی ٹوکا۔ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں پکڑے گلاس سے ٹیرس اور لاؤنچ میں موجود لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مومن نے اُس سے کہا۔

”تمہیں پتا ہے یہ سب کون ہیں؟“ ضوفی الجھا۔ اُس نے نیہا کو دیکھا۔ نیہا کو لگا مومن کچھ نشے

میں تھا۔

”یہ سب سٹارز ہیں۔“ ضوفی نے کچھ اٹک کر کہا۔ مومن مسکرایا۔

”نہیں یہ سب میرے fans ہیں اور پاکستان میں ان سے بڑھ کر میرا مداح کوئی نہیں۔ یہ

سب میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خواب ہے ان سب کا۔“ وہ ضوفی کے جملے ہی دہرا رہا تھا اور ضوفی کو عجیب سی ہنک محسوس ہوئی تھی۔

”تو یار دونا اُسے فلم میں چانس۔“ نیہا نے جیسے صورت حال سنبھالی۔

”کیسا چانس؟“ مومن نے جواباً بے حد سپاٹ لہجے میں اُس سے کہا۔

”اپنی فلم کے لیے آڈیشن کرو اُس کا۔ تم خود متاثر ہو جاؤ گے ضوفی کی اسکرین pressure اور

ٹیبلنٹ سے۔“ نیہا نے ملائم لہجے میں کہا۔

”I don't think so.“ مومن نے سر سے پاؤں تک ضوفی کو دیکھنے کے بعد اُسی اطمینان

سے گلاس ایک سے دوسرے ہاتھ میں بدلتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ ضوفی اور نیہا کھڑے کے

کھڑے رہ گئے تھے۔ ضوفی نے بے حد اپ سیٹ ہو کر شکایتی نظروں سے نیہا کو دیکھا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر اُسے تھپکتے اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”نشے میں ہے ابھی اس لیے اس طرح کی باتیں کر رہا ہے..... let him sober up.“

”What a beautiful piece of art.“

اُس ڈیزائنر نے مومن کو روکتے ہوئے اُس کیلی گرافی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ شاید پہلی بار

مومن کی کسی پارٹی میں آیا تھا اور پہلی بار اُس کیلی گرافی کو دیکھ رہا تھا۔

مومن اُس کی تعریف پر مسکرایا اور اُس نے کہا۔

”Thank you.“

”آرٹسٹ کون ہے؟“ اُس ڈیزائنر نے مزید پوچھا۔ چند اور لوگ بھی اب اپنے ڈرنکس

پکڑے اُس کیلی گرافی کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

”عبدالعلی۔“ ایک لمحہ کے توقف کے بعد مومن نے بالآخر کہا۔

”Amazing.“ اُس ڈیزائنر نے مزید سراہا۔

”Look at the strokes the curves, the colors.... brilliant.“ وہ اُسی

”لکھا کیا ہوا ہے؟“ ایک ماڈل نے اپنے امریکن لب و لہجے میں مومن سے پوچھا۔

”قرآن پاک کی آیت ہے۔“ مومن نے بتایا۔ وہ ماڈل بے اختیار ہنسی۔

”آف کورس، وہ تو جانتی ہوں میں لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟“ بیک وقت اُن تینوں چاروں

لوگوں نے مومن کو دیکھا۔ مومن نے محقق انداز میں پیش کی گئی اُس خطاطی پر نظر دوڑائی پھر مدھم آواز میں کہا۔

”میں نہیں جانتا۔“ وہ کہہ کر پلٹا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے ہٹ جاتا اُس کے سامنے

اُس کا ملازم ایک مہمان لے کر آیا تھا اور آنے والے مہمان کو دیکھ کر قلب مومن فریز ہو گیا تھا۔ شراب کا گلاس اُس کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بچا تھا۔

